جوامع السیرت

از

حکیم الاسلام مولانا سید محمد میاں صاحب

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی

اشاعت اول: جنوری 2009ء

اشاعت دوم: جولاء 2009ء

اہتمام:ابوالفضل نور احمد

کمپیوٹر لے آؤٹ: ندیم احمد سولنگی

طابع: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

ناشر: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ، کراچی

ہدیہ: 300/= روپے

اعلیٰ ایڈیشن: 400/= روپے

ایڈریس

حکمتِ قرآن اِنسٹیٹیوٹ

6 سندھی، جماعت کو آپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی،

جوگی موڑ بس اسٹاپ

نیشنل ہائی وے، کراچی 75030

رابطہ کیلئے 021-4213117

0300-2707097

Web:www.hikmatequran.org

فہرست مضامین

*

مقدمہ

مطالعۂ سیرت کے تقاضے

پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت پر مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ مگر مسلم اہل علم کی لکھی ہوئی ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد عمومی طور پر ایک بات محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ یہ کتابیں زیادہ تر تقدس کے جذبہ کے تحت لکھی گئی ہیں ۔ یہ طریقہ عقیدت مندانہ مطالعہ کے اعتبار سے اہم ہوسکتا ہے۔ مگر اس طرز پر لکھی گئی کتابوں کی وہ اہمیت نہیں ہوتی جو علمی انداز سے قلمبند ہونے والی کتابوں کی ہوتی ہے۔

نبی کریمﷺ کی سیرت سے دلچسپی محض حصول ثواب کی خاطر ہو تو ایسی کتابوں سے ممکن ہے یہ مقصد حاصل ہوجائے۔لیکن انسانیت کی ہدایت و ترقی کے لیے خیرامت کی ذمہ داری اس طرح کسی بھی صورت میں سرانجام نہیں دی جاسکتی۔ اس قسم کی مدحیہ تحریروں میں قاری کو صرف افتخار یا تقدیس کی غذا ملتی ہے،لیکن وہ رہنمائی نہیں ملتی جس کو قرآن میں أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۔ ۱۲) کہا گیا ہے۔ اسی رہنمائی کے نتیجہ میں مسلمانوں سے لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (توبہ ۔۳۳) کا وعدہ کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی گذشتہ ایک ہزار سالہ تاریخ غلبۂ اسلام کے بجائے غلامیوں اور

حزیمتوں کی ایک نہ ختم ہونے والی داستان بنی ہوئی ہے۔ اس صورتِ حال کی وجوہات کے بارے میں امت کے اکثر روشن فکر ارباب علم اس بات پر متفق رہے ہیں کہ ایک تو قرآن حکیم کی تعلیماتِ توحید سے روگردانی کی گئی ہے اور دوسرا پیغمبر اسلام کی بعثت کے اصل مقاصد اور طریقۂ نبوت سے انحراف کرکے رسمی مذہبیت اور جھوٹی تقدیس کو دین بنادیا گیا ہے۔

سیرت کی زیادہ تر کتابیں مقاصدِ نبوت کو پیشِ نظر رکھنے کے بجائے برکت کے حصول کے جذبے سے ہی لکھی گئی ہیں ۔ اس حوالے سے مولانا وحید الدین خان نے اپنی کتاب "سیرت کا مطالعہ" میں سیرت کے موضوع پر اک مشہور مصنف کی کتاب "السیرۃ النبویہ" کا حوالہ دیا ہے جس کےمقدمے میں صاحبِ کتاب لکھتے ہیں کہ:

"مولف کو معلوم تھا کہ سیرت کے موضوع پر لکھنے والوں نے بہت سی اہم کتابیں لکھی ہیں ، مگر مؤلف نے اس کو اپنی سعادت سمجھا کہ وہ سیرت کے عظیم موضوع پر ایک نئی کتاب لکھے اور اس طرح وہ سیرت نگاروں کی اس نورانی لڑی میں شامل ہوجائے:

وکان یری السعادۃ فی تالیف کتاب جدید فی السیرۃ النبویۃ لینخرط فی سلک المؤلفین النورانی فی ھذا لموضوع الحبیب الجلیل۔ (صفحہ10)

ظاہر ہے کہ یہ مطالعہ کا کوئی علمی

طریقہ نہیں ۔ اس طرز مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت کا موضوع مسلمانوں کے درمیان علمی و فکری ارتقا کا ذریعہ نہ بن سکا۔ وہ صرف عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین یا فخر و مباہات کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔

موجودہ زمانہ میں سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر اسی نوعیت کی ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لیے کتابِ فخر تو ضرور ہیں ، مگر وہ حقیقی معنوں میں ان کے لیے کتاب اسوہ یا کتابِ رہنمائی نہیں ۔

ہمارے سیرت نگار جب سیرت کے موضوع پر لکھتے ہیں تو وہ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ بعثت سے قبل عرب کی حالت کی نہایت تاریک تصویر پیش کرتے ہیں ۔ وہ بتاتے ہیں کہ بعثت سے قبل سارا عرب تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اخلاقی اعتبار سے لوگ وحشی بنے ہوئے تھے۔ درجنوں عورتوں سے نکاح کرکے ان کو اپنے گھر میں رکھ لیا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی باتیں پیغمبر اسلام ﷺ کے کارنامہ کو نمایاں کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں ۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب تک عربوں کو آخری حد تک برا ثابت نہ کیا جائے، پیغمبر اسلامﷺ کی عظمت ظاہر نہیں ہوسکتی۔ مگر یہ نہ صرف تاریخی حقائق کے خلاف ہے بلکہ خود قرآن و حدیث کے بھی خلاف ہے۔

اس طرح کی باتوں کا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں میں علمی نقطۂ نظر پیدا ئ

ہوسکا، مسلمان حقیقت پسند قوم بننے کے بجائے پر اسرار خیالات میں جینے والی ایک قوم بن گئے۔ کسی بھی حقیقت کو علمی اور تاریخی حیثیت سے سمجھنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ ان کے اکابر تک کا یہ حال ہے کہ وہ صرف پر اسرار اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہیں ۔ سائنٹفک اصطلاحوں میں سوچنا ان کے لیے ممکن ہی نہیں ۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلامؐ کو بہترین لوگوں میں پیدا کیا اس کی مزید تفصیل روایات میں آئی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ: اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا پھر مجھ کو بہترین انسانوں میں اٹھایا (ان اللہ خلق الخلق فجعلنی فی خیر خلقہ)
(تفسیر ابن کثیر ۳۷۱/۲)

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ جن عربوں کے اندر مبعوث کیے گئے وہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے پوری دنیا میں سب سے بہتر لوگ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی لیے یہ ممکن ہوا کہ آپ ایک ایسا انقلاب لائیں جس کی نظیر تاریخ میں موجود نہیں ۔ اگر عرب کے یہ لوگ ویسے ہی برے ہوتے جیسا کہ ہماری کتابوں میں بتایا جاتا ہے تو اصحاب رسول کی وہ اعلیٰ ٹیم ہی نہ بنتی جس کو قرآن میں خیر امت کہا گیا ہے (آل عمران۔۱۱۰) اور جس کی وجہ سے دین توحید کی عظیم تاریخ وجودمیں آئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حدیث کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا

ہے: خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا (فتح الباری ٦/٧٧٤)

اخلاق و کردار کے حوالے سے تاریخِ اسلام کا یہ واقعہ اس تمام مبالغے کو رد کرنے کے لئے کافی ہے کہ پیغمبر اسلامﷺ نے جب ہرقل شہنشاہِ روم کو اسلام کی دعوت کا خط لکھا تو وہ خط سے متاثر ہوا اور اس نے ابوسفیان کو بلایا جو اس وقت شام میں مکے کے ایک تجارتی کاروان کی قیادت کررہا تھا۔ ہرقل اور ابو سفیان کے درمیان پیغمبر اسلامﷺ کے متعلق جو مکالمہ ہوا وہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اگرچہ اس وقت ابوسفیان پیغمبر اسلام ﷺ کا سخت ترین دشمن تھا لیکن یہ ان کی اخلاقی کردار کی بڑائی تھی کہ وہ اس دشمنی کے باوجود رسول اللہﷺ اور ان کی تحریک کے متعلق پوچھے گئے تمام سوالوں کے جوابات ٹھیک ٹھیک دے رہا تھا۔

تمدنی طور پر حقائق کو دیکھا جائے تو عربوں کے ہاں مکے کی شہری ریاست تمام ضروری منظمات کے ساتھ موجود تھی جس میں عدالتی، فوجی اور انتظامی امور کا نظام قائم تھا، تاہم اس میں افراط و تفریط اور طبقاتی تضاد بہرحال موجود تھا جو ایک بڑی تبدیلی کا خواہاں تھا۔

مطالعۂ سیرت کے مذکورہ اسلوب نے پورے معاملہ کو غیر علمی بنادیا۔ مثلاً ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ بعثت سے پہلے عرب کے لوگ درجنوں کی تعداد میں بیویاں رکھتے تھے۔

دوسری طرف انہیں کتابوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ عرب اپنی لڑکیوں کو پیدا ہونے کے بعد مار ڈالتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس سماج میں لڑکیاں زندہ درگور کی جارہی ہوں وہاں عورتیں اتنی زیادہ تعداد میں کیسے پائی جائیں گی کہ لوگوں کو یہ موقع ملے کہ وہ لامحدود تعداد میں اپنے گھروں میں عورتیں رکھ لیں ؟

امرِ واقعہ یہ ہے کہ زیادہ تعداد میں نکاح کرنے کا رواج صرف کچھ سرداروں میں تھا، نہ کہ عام عربوں میں ۔ اور یہ سردار بھی یہ عمل اس لیے کرتے تھے کہ مختلف قبائل سے رشتہ داریاں قائم کرکے انہیں اپنی سرداری کے تحت متحد کرسکیں ۔ اسی رواج کو پیغمبر اسلامؐ نے بھی اسلام کے حق میں استعمال کیا۔ آپ نے بھی مختلف قبائل کی خواتین کو اپنے نکاح میں لیا تاکہ ان قبائل کو جنگ کے بغیر اسلام کا حامی بناسکیں ۔

جہاں تک لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا معاملہ ہے تو وہ صرف استثنائی طور پر بعض غریب قبائل میں تھا۔ عام عرب اس کو سخت معیوب سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ غریب خاندانوں کی مالی مدد کرتے تھے تاکہ وہ اس وحشیانہ رسم سے باز رہیں ۔ ایک ہی صحابی کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قبل از اسلام اپنی بیٹی زندہ درگور کرنے پر، بہت درد اور کرب میں مبتلا رہتا تھا اور تادمِ مرگ اس درد میں روتا رہا۔

علمی مطالعہ کے بجائے عقیدت مندانہ

مطالعہ سے یہ نقصان ہوا کہ ہمارے سیرت نگار بہت سی ایسی حقیقتوں کو دریافت نہ کرسکے جو قرآن میں صراحتاً مذکور تھیں ۔ ان میں سے ایک معجزۂ نبی کا مسئلہ ہے۔ ہمارے سیرت نگار عام طور پر کثرت سے پیغمبر اسلام ﷺ کے معجزات کا ذکر کرتے ہیں ۔ مگر یہ پورا تصور قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو اس قسم کے معجزے نہیں دیے گئے جو پچھلے پیغمبروں کو دیے گئے تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ سے آپ کے مخالفین یہ مطالبہ کرتے تھے کہ اگر تم پیغمبر ہو تو دوسرے نبیوں جیسا حسی معجزہ ہمیں دکھاؤ۔ پیغمبر اسلام ﷺ لوگوں کی ہدایت کی امید میں یہ چاہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی معجزہ ظاہر کیا جائے۔ مگر قرآن میں آپ کی اس خواہش کو رد کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا:

”اور اگر ان کی بے رخی تم پر گراں گزرر ہی ہے تو اگر تم ایسا کرسکتے ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے لیے کوئی نشانی (معجزہ) لے آؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کردیتا۔ پس تم نادانوں میں سے نہ بنو۔“ (الانعام۔۳۵)

دوسری جگہ قرآن میں اس مستقل پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے برعکس ، پیغمبر آخر الزماں کو حسی معجزے نہیں دیے جائیں گے۔ قرآن کی درج ذیل آیت اس حوالے سے حتمی بیان کا درجہ رکھتی ہے:

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۵۹ (بنی اسرائیل ۵۹)

"اور ہم کونشانیاں (معجزے) بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی ان کو سمجھانے کے لیے۔ پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور نشانیاں ہم صرف ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں ۔"

ہمارے ہاں جو غیر علمی رویہ اختیار کیا گیا اس کے پس منظر میں غالباً یہ نفسیاتی رویہ کار فرما رہا ہے کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ پیغمبر اسلام ﷺکو حسی معجزے نہیں دیے گئے تو وہ پچھلے انبیاء کے مقابلے میں کچھ کم ہوجائیں گے۔ اس لیے غیر واقعی طور پر انھوں نے آپ ﷺکی ذات کے ساتھ بہت سے معجزے وابستہ کردیے ۔ حالانکہ قرآن میں صراحتً اس کی تردید موجود تھی۔

خود حدیث میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ آپ کو اس قسم کے معجزے نہیں دیے گئے جس طرح کے معجزے پچھلے نبیوں کودیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں صحیح بخاری کی یہ حدیث قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: "نبیوں میں سے ہر نبی کو ایسی نشانی دی گئی جس کو اس زمانے کے لوگ مانتے تھے۔ اور مجھ کو وحی (قرآن) کا معجزہ دیا

گیا اس لی میں امید کرتا ہوں کہ قیامت میں مجھ پر ایمان لانے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی”

مامن الانبیاء نبی الاعطی من الایات ما مثلہ امن علیہ البشر و انما کان الذی اوتیتہ وحیا اوحاہ اللہ الی فارجو ان اکون اکثرھم تابعا یوم القیامۃ (فتح الباری ۶۱۹/۸)

اصل یہ ہے کہ جن واقعات کو پیغمبر اسلام ﷺ کے معجزات کے طور پربیان کیا جاتا ہے وہ سب نصرت کے واقعات ہیں جو ہر مومن کے ساتھ پیش آتے ہیں ۔ اور وہ پیغمبر اسلام کو زیادہ اعلیٰ اور افضل صورت میں دیے گئے۔ معجزہ ایک ایسے خارق عادت واقعہ کا نام ہے جو مخاطبین کے مطالبہ پر پیش کیا گیا ہو۔ مثلاً عصاء موسیٰ کا معجزہ۔ مگر اس نوعیت کا کوئی معجزاتی واقعہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں ثابت نہیں ۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت کو سمجھنے میں دوسری بڑی رکاوٹ محسنِ انسانیت ﷺ کو ایک ایسے مذہبی رہنما کا درجہ دینا بھی ہے جس کے مطابق حضور ﷺ بس چند اعتقادات، چند رسوم و عبادات، چند اوراد و وظائف، چند اخلاقی سفارشیں اور چند فقہی احکام پہنچانے آئے تھے اور آپ کا منشا ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو شخصی طور پر معاشرہ کی عام خامیوں اور گندگیوں سے مبّرا ہوں اور ایسے لوگ طہارت، نماز، روزہ، نوافل و اذکار کے پابند ہوں ۔ علاوہ ازیں یہ لوگ انفرادی اخلاقی حد تک اپنے اندر

سنتِ رسول ﷺ پر قائم رہنے والے ہوں ۔ سنت کے اسی محدود اتباع کے نتیجے میں خیرِ امت کے طور پر انسانیت کے لیے وہ تحریک اور اس کی سرگرمی پیدا ہی نہیں ہوسکی جو دنیا کے عظیم عملی انسان کے پیروکاروں کا وتیرہ ہونا چاہیے۔

اسی طرح پیغمبرِ اسلامﷺ انسانیت کی ہدایت و نجات کیلئے جس طرح سرگرداں اور سرگرم رہتے تھے تا آنکہ جبرئیل آکر کہتا تھا کہ “اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالو گے کیا؟ آپ ﷺ نے اس طرح خود کو اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف کرلیا تھا اور وہ استغنا اختیار کیا کہ تین تین دن تک گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ یہ ساری باتیں ہمارے لیے اتباع سنت کا مواد نہیں ہیں ۔ ان کی جگہ پر مخصوص لباس جس میں مسواک کی جیب بھی لازمی لگی ہوئی ہو ہمارے لیے سنت کےاتباع کا بہت بڑا منہاج بن گیا ہے!

سیرتِ نبوی ﷺ کو سمجھنے میں تیسرا اہم پہلو قرآن کی فکری تعلیم کو نظر انداز کرنا ہے۔ قرآن کی اس بنیادی تعلیم کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے کہ اسلام معاشرے کی طبقاتی نہج کو تبدیل کرکے توحیدی معاشرے قائم کرنے والی انقلابی تحریک تھی، اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اس تحریک کو ایسی بنیادوں پر ایسا استحکام عطا کیا کہ معاشرے کی طبقاتی نہج آئندہ کی تمام انسانیت کیلئے مذموم قرار پائی۔

انسانوں کی اجتماعی زندگی، تمدن اور

معاشرے کی ایسی تشکیل جس میں تمام انسانی غلامیوں کا خاتمہ، نیکی، عدل و انصاف، اور تمام انسانوں کو رزق کے وسائل مہیا کرنا انسانوں کی مشترکہ ذمہ داری ہو، یہ تمام کام نبوت کے مقاصد سے خارج کردیے گئے ہیں ۔ بنیادی انسانی حقوق، امن و آشتی اور سماجی انصاف کے ذریعے افراد کے انسانی جوہر کی ترقی اور کامرانی کے ذرائع جن سے انسانیت حَسَنَۃً فِی الدُّنْیَا کے ذریعے حَسَنَۃً فِی الْاٰخِرَۃِ (بقرہ ۲۰۱)سے بھی بہریاب ہوسکے آج ہمارے ہاں دین کے کام کا حصہ نہیں رہے اور صرف سیکولر لوگوں کے کرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں ۔

قرآن میں پیغمبر اسلام ؐ کی ذات اور مشن کو نہایت پر عظمت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝۱۰۷ (الانبیاء ۱۰۷)

یعنی " ہم نے تم کو سارے عالم کے لیے رحمت بناکر بھیجا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام ؐ اپنے مشن کے ذریعے ایک ایسا کارنامہ انجام دیں گے جو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے رحمت کا سبب بن جائے۔ لیکن سیرت نگاروں نے سیرت کے حوالے سے اس رحمت کو بھی پیغمبر ؐ کے قائم کردہ نظام کے بجائے ان کے معجزات میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پیغمبر اسلام ؐ کے مشن

کے بارے میں قرآن حکیم نے صاف کہا ہے کہ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ
اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ
وَالْحِکْمَۃَ وَ اِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ
۱۶۴ (آل عمران ۱۶۴)

"بلاشبہ یہ اللہ کا مومنوں پر بڑا ہی احسان تھا کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا جو انھیں میں سے ہے، وہ اللہ کی آیتیں سناتا ہے، ہر طرح کی برائیوں سے پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے (اس نے ہدایت کی راہ ان پر کھول دی) حالانکہ اس سے پہلے گمراہی میں مبتلا تھے۔"

تعلیماتِ قرآن کے ذریعے انسان کی سربلندی، انسان کا تزکیہ و شخصی ارتقا اور حکمت کے ذریعے تعمیر و تسخیرِ کائنات نبوت کے مقاصد قرار دیے گئے۔ پھر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک برتر نظام کے ساتھ جماعت کی تشکیل / پارٹی ڈسپلن اور اس کی خوبیاں قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمائیں :

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ
رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (الفتح ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں ۔"

ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ
لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ۞
۳۳

(التوبہ ۳۳)

“اسی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت او دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کردے خواہ یہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار ہو۔”

قرآن کی ان آیتوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کوئی سادہ بات نہ تھی، وہ ایک عظیم انقلابی منصوبہ تھا۔ آپ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کو ایک عظیم واقعہ ظہور میں لانا تھا، ایک ایسا واقعہ جو پوری انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دے۔ لیکن سیرت کی عام کتابیں پیغمبر کے اس عظیم کارنامہ کی تصویرنظر نہیں آتیں ۔

پیغمبر اسلام ؐ نے خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر اور ایک عظیم رہنما کی حیثیت میں اپنے دور کی تمام انسانی غلامیوں کا خاتمہ کرکے، توحید کی بنیاد پر ایک نئے عالمی نظام کو ایک منظم جماعت کی تشکیل سے نہ صرف جزیرہ العرب میں غالب کیا بلکہ اس وقت کی دوبڑی غاصب سلطنتوں قیصر و کسریٰ کے نظامِ استبداد کی ہلاکت کی بنیادیں ڈال دیں ۔ اس کے بعد انسانی حقوق، آزادی، جمہوریت، مساوات اور انسانی اور فلاح و سعادت کا ایسا دور شروع ہوا جس سے پوری انسانیت پیغمبر اسلامؐ کی رحمۃ للعالمینی سے فیضیاب ہوتی رہی۔ اب یہ فلاح و سعادت صرف انسانوں کی اس زمینی حیات سے تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ اسی زمینی حیات کے افعال و اعمال پر معاد (آخرت) اور مستقل حیات کی فلاح و سعادت منحصر ہوئی۔ اور اسی سے امرِ خیر

اور حسنِ عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی دائمی سعادت کی زندگی بھی انسانوں پر آشکار ہوئی۔

پیغمبرِ اسلامؐ کی اسی سیرتِ طیبہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے زندگی کا بہتر نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ ختم نبوت کے بعد لیظہرہ علی الدین کلہ کی ذمہ داری اب خیرامت پر ہے جو اسی اسوۂ حسنۂ پر مذکورہ ذمہ داری کو سرانجام دے گی۔ اگر یہ امت انھی مقاصد اور منشائے خداوندی کے تحت یہ کام سرانجام نہیں دے گی تو طرح طرح کے امراضِ قلوب ان کی زندگی کو مستقل روگ بنادیں گے۔ ہم مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ اس قسم کے روگ اور دکھوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم نے ان امراض کی مسیحائی فضائل میں بھی تلاش کی ہے، اور اوراد و وظائف میں بھی، صلوٰۃ و سلام سے بھی مداوا چاہا ہے اور ختم بخاری سے بھی۔ زندگیوں کو پارسائی کے مخصوص قالب دینے کی کوششیں بھی کی ہیں اور اپنی پسند کی فرمانبرداریوں کے جالے بھی بنے ہیں ۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود ہمارے فرمانبرداری کے معیار ہماری سمت کو درست نہیں کرسکے ہیں ۔ یہ سب کوششیں ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کی جماعت کا وَ الَّذِینَ مَعَہٗ، (الفتح۔۲۹) نہیں بنا سکی ہیں ۔ اسوۂ حسنہ کے مطابق اس عمل صالح کی توفیق نہیں دے سکیں جو ہماری مغفرت اور اجر عظیم یعنی ہماری نجات اور کامرانی کا باعث بن سکے۔

ہماری نجات اور کامرانی کا صرف یہی حل

ہے کہ ہم قرآن کو مطلوب اسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی جییں یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہماری انفرادی اور ملی زندگی کے راستے ہم پر آسان ہوجائیں گے۔ سچ کہا ہے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے کہ:

"اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے۔ اور جب تک دنیا باقی ہے صاحبِ قرآن کی سیرت و حیاتِ مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراض و عللِ ارواح کا اور کوئی علاج نہیں ہے" (رسولِ رحمت ص ۱۳)

قرآن حکیم کی بتائی ہوئی پیغمبر اسلامﷺ کی سیرت کے تین مرکزی نکات مثالی کردار، عظیم پیغام اور جہدو استقامت اس طرح تکوں بنے ہوئے ہیں کہ اس کا ہر کونہ اپنی بستگی کو ضیا پاشی عطا کر رہا ہے۔ ان تینوں کونوں سے ہی اسلامی انقلاب کی عظیم تشکیل کا رنگ ساری انسانیت نے دیکھا۔ اس لیے سیرت کے مطالعہ میں ان تینوں عنوانات کو سمجھنے کی بے حد ضرورت ہے۔

مثالی کردار

داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبداللہ ﷺ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپ اپنی قوم میں سب سے زیادہ بااخلاق، پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والے، حلیم و بردبار، صادق و امین، جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش گوئی

اور دشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے۔
اسی وجہ سے آپ کی قوم نے آپ کا نام "الامین" رکھا تھا۔ (خصائص کبری جلد ۱ ص۹۱)

شباب کی عمر کو پہنچے تو مکے میں آنے والے مسافروں کی خبر گیری، مساکین کی امداد اور مظلوموں کی مدد کو اپنا شعار بنالیا۔ نوجوانوں کا ایک گروپ تشکیل دیا جو یہ کام مشنری اسپرٹ سے کرتے رہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حکم بن خزام اس گروپ میں ساتھ تھے۔ فجار کی لڑائی کی وجہ سے سیکڑوں گھرانے برباد ہوئے اور ہر سُو انارکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس صورتِ حال سے تنگ آکر کچھ خیر پسندوں نے اصلاح کی ایک تحریک شروع کی، آنحضرت ﷺ کے ایک چچا زبیر ابن عبدالمطلب کے تحرک پر عربوں کا ایک کنونشن "حلف الفضول" کے نام سے منعقد ہوا۔ نوجوانوں کی طرف سے حضرت محمد ﷺ نے اس میں بھرپور کردار ادا کیا۔ چنانچہ یہ معاہدہ ہوا کہ ہم :

(۱) ملک سے بدامنی دو ر کریں گے
(۲) مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے
(۳) غریبوں کی امداد کریں گے
(۴) مظلوم کی حمایت کریں گے
(۵) کسی ظالم کو مکے میں نہ رہنے دیں گے۔

متشدد قبائلی عصبیت کے سماج میں غریبوں کے معاشی استحکام کی منصوبہ بندی اور ہر مظلوم کی حمایت کا عہد خواہ مظلوم کوئی بھی ہو یہ ایک غیر معمولی تحریک اصلاح اور

نظام کی تبدیلی کی جستجو تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ اس معاہدہ میں سرگرم شرکت پر ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ اگرچہ عربوں کی انتقامی اور عصبی جاہلیت نے بعد میں اس معاہدہ کو کالعدم قرار دے دیا جب خود حضورﷺ کی مخالفت میں ظالم و مظلوم کا امتیاز بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ لیکن پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اسلامی فکر سے عالمِ انسانیت کو جو مستقل اقدار عطا کیں اس سے ان قدروں کو انسانیت کے لیے دائمی ورثہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

آنحضرت ﷺ ذریعۂ معاش کے لئے قریش کے تجارتی سلسلہ میں شامل ہوگئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کے حسن معاملہ اور دیانتداری کے ہر طرف چرچے ہونے لگے جس کی وجہ سے ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنے کاروبار میں حضورﷺ کو بھی شریک کرے۔ آپ کی شخصی دیانتداری اور حسن معاملہ کا وہ اعلیٰ معیار تھا جس کی بنا پر قوم نے متفقہ طور پر آپﷺ کو "امین" کا لقب دے دیا۔ قبل از نبوت روزانہ کی عام زندگی میں پیغمبر اسلامﷺ کے جو معمولات تھے اس میں اپنے گرد موجود سماج کی اصلاح کے لیے تفکر اور عملی کوششوں کی روداد پر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں تمام تفصیل کے ساتھ واقعات مذکور نہیں ہیں ۔ شاید قبل از نبوت کی پیغمبر اسلام کی بھرپور سماجی زندگی کو نبوت سے علاحدہ دنیوی کاموں میں شمار کرکے ان کو سیرت کی کتابوں کا حصہ بنانا ضروری نہ سمجھا گیا ہو

لیکن اس کے باوجود سیرت کی کتابوں میں جمع شدہ واقعات کا بغور مطالعہ کرنے سے پیغمبرِ اسلام ؐ کی اس متحرک سماجی زندگی کا بھی ایک واضح عکس ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

مثلاً پہلی وحی کی آمد کے بعد پیغمبر اسلام ؐ جب اضطراب کی حالت میں گھر پر تشریف لائے تو بی بی خدیجہ الکبریٰ نے اطمینان دلاتے ہوئے جن الفاظ میں شہادت دی تھی، تاریخ نے ان الفاظ کو سیرت کے کئی پہلوؤں کا مینار بنادیا ہے۔ بی بی خدیجہ الکبریٰ کی شہادت ان الفاظ میں تھی:

“ اللہ کی قسم! آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی بے مدد نہیں چھوڑے گا۔ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں ، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں ، ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں ، مہمان نوازی کرتے ہیں ، اور جائز ضرورتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں ۔”
(الرحیق المختوم ص ۹۹)

بی بی خدیجہ الکبریٰ کی پندرہ سالہ رفاقت کی یہ شہادت پیغمبرِ اسلامؐ کی قبل از نبوت سماجی زندگی کا جامع اور بھرپور تعارف ہے۔ آپ ؐ اپنے سماج کو بدلنے، انسانی غلامیوں سے نجات دلاکر ان کو ایک اللہ کی عبدیت میں لانے کے لیے ایک طرف غار حرا کی تنہائیوں میں غورو فکر کر رہے ہیں اور دوسری طرف سماج میں اپنے ایک مؤثر عملی انسان دوست کردار سے سماج کی تبدیلی کے کام کا آغاز کرتے بھی نظر آتے ہیں ۔ یہی وہ

عملی کردار تھا جس کو لیکر پیغمبر اسلامﷺ صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہوکر مکہ کی آبادی کے لوگوں کے درمیان پیش کرتے ہیں کہ (میری چالیس سالہ زندگی کے کردار کی روشنی میں) بتاؤ اگر میں یہ خبر دوں کہ پہاڑی کے پیچھے اک لشکر تمہاری تباہی کے لیے کھڑا ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟ اس وقت تمام موجود لوگوں نے بیک آواز کہا تھا کہ "ہاں ! تم امین و صادق ہو ہم تمھاری بات سچ مانیں گے"۔ پیغمبر اسلامﷺ نے اس وقت دعوت الی اللہ کےلیے کسی معجزے کے بجائے اپنے کردار کو پیش کیا، حالانکہ صاحب نبوت کی حیثیت سے وہ کوئی بھی خرق عادت واقعہ رونما کرکے اپنی صداقت کا یقین و اعتقاد حاصل کرسکتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ ایک نئے دور کو جنم دینے والے تھے جس میں کردار و عمل کی اصل اہمیت ہوگی، اس لیے اپنے اسی کمال معجزے کے ساتھ صفا کی پہاڑی پر اعتماد کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور اپنے تمام دعوتی متبعین کے لیے یہ مثال قائم کردی کہ آنے والے دور میں انسانوں کے درمیان معجزوں اور کرامات کی بنیاد پر نہیں جلنا ہوگا بلکہ انقلاب اور تبدیلی کےلیے وہی اشخاص انسانوں کے درمیان جا سکیں گے جن کے پاس عمل اور کردار کی ٹھوس بنیادیں ہوں گی۔ اور یہی عمل اور کردار ان کی کامرانیوں کا پیش خیمہ بنے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اسی کردار کا قرآن مجید بھی اس طرح ساکھی بناکے نبوت ملنے کے بعد

جب ہر طرف سے مخالفت کا ہجوم اُمڈ آیا، تو لوگ آتے اور آپ کے دعویٰ کا ثبوت طلب کرتے تو حضورﷺ فرماتے کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۶

(یونس ۔۱۶)

“میں اس سے پہلے تمہارے درمیان ایک عمر بسر کرچکا ہوں ، پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟”

میں نے تمہارے درمیان اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا میری زندگی میری صداقت کی زندہ شہادت نہیں ؟ کیا تم میری اس چالیس سالہ زندگی میں جس کا ایک لمحہ تمہارے درمیان بسر ہوا ہے، کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش کرسکتے ہو جس سے میری صداقت کے متعلق ذرا سا شبہ گزرے؟ یہ چیلنج پوری قوم کو دیا گیا اور اس کے خلاف کسی نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ کسی کے آئینہ صفت ہونے کی اس سے بڑھ کر شہادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ دشمنوں کے ہجوم میں خود بسر کی گئی زندگی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا جائے اور اس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جائیں ۔

عظیم پیغام

پیغمبر اسلام ﷺ نے کسی اعتقاد، کسی نظریہ اور کسی نقشۂ فکر کے بغیر اصلاح و تعمیر کا کام یونہی شروع نہیں کردیا۔ محض ایک مبہم جذبہ نہیں تھا، کوئی ذاتی ولولۂ خام نہ تھا، بلکہ

حضور ﷺ کون و مکان کی عظیم ترین سچائی
کی مشعل لے کر اٹھے تھے۔ انتہائی حساس قلب
کے ساتھ برسوں حضور ﷺ نے زندگی کے رمز و
معنی کو پانے کی جستجو کی تھی، غار حرا کی
خلوتوں میں مدتوں اپنے اندرون کا بھی مطالعہ
کیا اور بیرونی عالم پر بھی غور کیا۔ تمدن کے
صلاح و فساد کے اصولوں کو سمجھنے میں بھی
دماغ کھپایا، لیکن عملی اقدام اس وقت تک
نہیں کیا جب تک علم الٰہی نے آپ کے قلب کو
حقیقت سے منور نہیں کردیا اور سب سے بڑی
سچائی پوری طرح آپ کے سامنے بے نقاب نہیں
ہوگئی۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ کائنات
کا ایک مالک ہے اور انسان اس کا بندہ ہے۔ یہ
توحید کا مژدہ ایک نئے نظام کی بنیاد تھی۔
انسانی آزادیوں کا ایک ایسا اعلان کہ مکے کے
سردار، رئیس، دولتمند اور مذہبی پروہت اس
اعلان سے بدک گئے۔ مکے کے یہ طبقات تمام
انسانوں کو ہرقسم کی غلامیوں سے نکال کر
ایک اللہ کی بندگی اور غلامی میں لانے کے اس
اعلان سے مشتعل ہوگئے۔ انھوں نے الوہیت کے
حقوق خدائے واحد سے الگ کرکے اپنے درمیان
بانٹ رکھے تھے۔ انسان کا اپنا نفس اور اس کی
خواہشیں ، خاندان اور برادری کی رسمیں ،
نسلی، قومی اور قبیلائی روایات، جاگیردار اور
برہمن طبقوں کی بالادستی، شاہی خاندانوں
اور درباری اشرافیہ کی کبرپسندی (جس کو
قرآن نے مُسْتَكْبِرِينَ (المؤمنون۔ ٦٧) کا نام دیا ہے)۔
یہ مختلف طبق بر طبق الوہیتیں تھیں جن کے

نیچے عام آدمی پس رہا تھا۔ عام لوگ غلامانہ انداز سے ان طبقات کی اناؤں ، مفادات، اور خواہشات کی تکمیل کے لیے کولھو کے بیل کی طرح کی زندگی جیتے رہے تھے۔

توحید ان تمام مروجہ الوہیتوں کے انکار کا پیغام تھا جو غلامی کی ان تمام بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کی عبدیت کی نئی عمارت کھڑی کررہا تھا۔

اہل مکہ توحید کے پیغام میں مضمر انسانی آزادیوں ، حریت اور مساوات کی اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے اس لیے وہ صفا کی پہاڑی پر یہ پیغام سنتے ہی سیخ پا ہوگئے۔ اگر یہ پیغام محض چند عقائد و عبادات کے طریقہ کار پر مشتمل ہوتا یا انفرادی زندگی کے کچھ اصلاحی و اخلاقی طریقوں کا مجموعہ ہوتا تو اس پر اہل مکہ یہ ردِ عمل ظاہر نہ کرتے۔ کیونکہ ان کی اکثریت حضرت ابراہیم علیسلم کو اپنا مورثِ اعلیٰ مانتی تھی۔ نماز، روزہ اور عبادت کا ایک سسٹم بھی ان کے ہاں موجود تھا اور عبادات کے اس سسٹم کی اصلاح ان کو اس انتہائی ردِعمل تک نہیں لے جاتی کہ وہ مکہ کے ایک بااثر خاندان کے بے حد نیکوکار شخص کے قتل پر بھی آمادہ ہوگئے۔ اصل میں توحید کا پیغام توہمات اور غلامیوں اور طبقاتی تضاد کے پورے سماج کی تبدیلی کا پیام تھا اور اس کے لیے ان کا ردِعمل بھی اس کے مطابق تھا۔

جب مُسْتَکْبِرِنَ اور مُتْرَفِنَ (غاصب و آمر رؤسا اور دولتمند) طبقوں کی اقلیت احبار و

رہبان یعنی مذہبی پیشہ ور طبقوں کے تعاون سے مُسْتَضْعَفِنَ یعنی کمزور اکثریت پر اپنے خدائی اختیار کی حد تک غاصب بنی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ کی مشیت نے پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ اسی طرح اس سماج کو بدلنے کا ارادہ فرمایا جس طرح نمرود و فرعون اور قارون کے استبداد و غلامی سے انسانوں کی آزادی کا حضرت ابراہیم علیسلم اور حضرت موسیٰ علیسلم کے ذریعہ سے نجات اور ہدایت کا بندوبست فرمایا تھا۔ قرآن میں پیغمبروں کے تاریخی پس منظر سے واضح ہوجاتا ہے کہ نبوت اور انبیا کی بعثت کا مقصد دراصل غلام اور آقا پر مشتمل معاشرہ کی ہیئت ترکیبی کو بدلنا تھا۔ یعنی توحیدِ الٰہی کے نظریہ کو عمرانی لحاظ سے معاشرہ پر منطبق کرتے ہوئے متضاد معاشی طبقات کے معاشرہ کو ختم کرکے توحیدی غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنا تھا، جو خوف یعنی جنگ و فساد اور بغاوتوں اور رہزن یعنی غربت، بھوک، ناداری، جہالت اور غلامی سے پاک معاشرہ ہو۔

توحید کا پیغام واشگاف الفاظ میں یہ اعلان تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عظمت مجھے تسلیم نہیں ، کسی کی بالادستی قبول نہیں ،کسی کا بنایا ہوا ضابطہ و قانون منظور نہیں ، کسی کے حاصل کردہ فوق الانسانی حقوق جائز نہیں ، کسی کے سامنے سرِتسلیم خم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کی رضا جوئی اب نہیں کی جائے گی اور کسی کے اشارۂ ابر و پر

اب زندگی کا نظام نہیں چلے گا اور خدا کے سوا ہر دوسری خدائی توڑ دی جائے گی۔ سب انسان بنیادی انسانی حقوق میں یکساں ہونگے۔ سب انسانوں کو اللہ کے عیال کی حیثیت حاصل ہوگی۔سب کو ایک جیسا انصاف مہیا ہوگا۔ سب کی بنیادی انسانی ضرورتیں مساوی ہوں گی۔ فخر و کبر کی تمام روایتیں ختم ہوں گی۔ اب اکرام و عظمت کی بنیاد صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق کی بنیاد پر ہوگی جو اس کے قوانین کا احترام کرے گاوہی محترم ہوگا۔ جو لوگ ان قوانین کے مطابق زندگی گزاریں گے، اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں وہی لوگ فلاح پائیں گے۔

اس کے دوسرے جز میں یہ اقرار شامل تھا کہ انسانی ہدایت اور سماج کی اصلاح کے لیے واحد ذریعہ وہ سلسلۂ نبوت و رسالتٔ جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعہ آیا ہے اور اسی سے عقل انسانی کو سوچنے کے رہنما اصول ملتے ہیں ۔ اور محمد ﷺ اسی سلسلۂ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں اور اب زندگی کی رہنمائی اسی ہستی کے واسطے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اب اسی رسول ﷺ کے اسوۂ حسنۂ پر توحید کے اسی مفہوم کے ساتھ یہ خیرِامت انسانوں کو فلاح و کامرانی عطا کرنے کی ذمہ دار بنائی گئی ہے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے جس دینِ حق کی تعلیم دی اس کا مقصد صرف ظاہری عبادات و رسوم کی ادائیگی اور مساجد کی

تزئین و آرائش کرنا نہیں تھا، بلکہ دنیا سے بلا لحاظ مذہب و ملت، جہالت، غربت و افلاس، قتل و غارت گری، جنسی آوارگی، شراب نوشی و قماربازی، محنت کے استحصال، مذاہب کے درمیان نفرت و جارحیت اور فساد و بدامنی کا خاتمہ کرنا تھا۔ اسلامی انقلاب ایک انٹرنیشنل تحریک تھی اور معاشرے کی اس تبدیلی کا مقصد یہ تھا کہ فرد اپنی مادی جسمانی ضروریات سے مطمئن ہوکر اپنا یقین اللہ پر قائم کرنے کے قابل ہوجائے۔تاکہ وہ وعدہ کی گئی اپنی سعادت و راحت ، فلاح و کامرانی کی ابدی زندگی کو پاسکے جہاں وہ خالقِ کائنات اللہ کی ذات سے راضی ہو اور اللہ اس سے راضی ہو۔

جہد و استقامت

جہد و استقامت پیغمبر اسلامؐ کی عملی زندگی کا تیسرا اہم معیار ہے۔ جس کام کوسرانجام دینے کا آپ نے بیڑہ اٹھایا اس کو جہد و سرگرمی کی انتہائی کوششوں سے کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔ دعوت کے کام سے لے کر اسلامی انقلاب کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو ختم کرنے تک اور غار حرا کے پہلے پیغام سے لےکر زندگی کے آخری لمحے تک، ہر لمحہ اسی دعوت کی فکر تھی اور اسی دعوت کی تڑپ تھی۔ مکہ کی گلیوں میں رات دن ایک کرکے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانا، عکاظ کے میلوں کا گشت، طائف کے کوچے و بازار میں خون آلود ہونا، بدر و حنین کے معرکے اور جزیرہ العرب کو

سلامتی کی آماجگاہ بنانا غرض ایک ایک لمحہ سخت جہد و استقامت کا لمحہ ہے۔

مکہ میں دعوت کے ابتدائی دنوں میں صعوبتوں و آلام کی جو صورتِ حال تھی اور بادِ مخالف کا جھکڑ، سرکشوں اور مستبد قوتوں کا گھیراؤ ہر وقت زندگی کا چراغ گل کرنے کے در پے تھا۔ جب چچا ابوطالب نے اس گھیراؤ کو تنگ محسوس کیا اور بھتیجے کو توحید کے پیغام میں مصالحت کی پیش کی تو پیغمبر اسلامﷺ کے پائے استقامت میں ذرّہ برابر لغزش نہیں آئی۔ آپ نے و اشگاف الفاظ میں فرمایا کہ:

> "چچا جان! خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں کہ میں اس کام کو اس کی انتہا تک پہنچائے بغیر چھوڑدوں ، یہ ممکن نہیں ہے"

توحید کی دعوت کے لیے قسم قسم کی صبر آزما اور جگر گداز وادیوں سے گزرنا پڑا۔ یہ دعوت ہر طاغوتی مستبد قوت کے خلاف اعلان جنگ تھی۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ تنہا ان سب کی مخالفت کا مقابلہ کرتے رہے۔ پھر اس کشمکش میں فریب کاریوں اور سوقیانہ جملہ بازیوں سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس داعیِ حق و صداقت نے ان حملوں کے مقابلہ میں اخلاق و شائستگی اور تہذیب و اصول پسندی کا دامن نہیں چھوڑا۔

مخالفین آپ کے کھلے دشمن تھے، اس لیے دنیا کے عام معیاروں کے مطابق، ان کے ساتھ آپ

کا تعلق، انتقام اور عداوت کا تعلق ہونا چاہیے تھا۔ لیکن آپ کا ان کے ساتھ تعلق اس قسم کا نہیں تھا۔ آپ کا ان کے ساتھ ایسا ہی تعلق تھا جیسے کسی طبیبِ مشفق کا مریض سے ہو۔ آپ دیکھتے تھے کہ ان کی انسانیت مجروح ہوچکی ہے، اس لیے آپ چاہتے تھے کہ ان کا علاج ہوجائے۔ لیکن ان کی ضد اور سرکشی ایسا ہونے نہیں دیتی تھی۔ اس لیے وہ اس کے قریب نہیں آتے تھے۔ یہ طبیبِ مشفق جانتا تھا کہ ان کا مرض انہیں کسی نہ کسی طرح ہلاکت و تباہی کی طرف کھینچ لیے جا رہا ہے۔ اس لیے ان کی ضد پر آپ کا دل کڑھتا تھا اور ان کی گمراہی کا غم آپ کو بے چین کیے دیتا تھا۔ قرآن اس کی شہادت ان الفاظ میں دیتا ہے:

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝۷۰ (النمل۷۰)

“(اے پیغمبر!) ان کے اوپر غم نہ کھاؤ اور جو کچھ یہ لوگ خفیہ تدبیریں کرتے ہیں ، ان کی وجہ سے دل میں تنگی محسوس نہ کرو۔ ”

پیغمبر اسلامؐ کو ان تکالیف سے زیادہ اپنے اس مشن کی کامیابی کی امید تھی جس میں انسانیت کو معرفت خداوندی کے ذریعے فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہونا تھا۔ آپ نے صحابہ کی ایک عظیم جماعت تشکیل دی جن کی منظم طاقت سے ایمان، دعوت و جہاد کی اعلیٰ حکمت عملیوں سے عظیم مقاصد حاصل کیے گئے۔ اور توحید کی عالمگیر ترویج و اشاعت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو ہٹادیا گیا۔

انسانی آزادیوں اور مساوات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میثاق مدینہ کے ساتھ ایک ربانی سماج وادی جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی جس کے ذریعے قرآن حکیم کے انسانیت کی فلاح و کامرانی کے بتائے ہوئے اصولوں کو عملی شکل میں لاکر امن و آشتی اور فلاح و کامرانی کا مثالی نظام قائم کیا گیا۔ اس طرح پیغمبرِ اسلامؐ کی قائم کردہ جماعت کے ذریعے پوری انسانیت کو پیغام دیا گیا کہ آنے والوں ادوار میں استحصال و غلامی، ظلم و جبر اور آمریت کی بنیاد پر کوئی بھی نظام انسانیت کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔

سیرت کے متذکرہ جامع پہلوؤں کی روشنی میں برصغیر کے اندر گذشتہ چند دہائیوں میں کسی قدر جو تحقیقی کام ہوا ہے، ان میں شیخ الاسلام مولانا محمد میاں کی کتاب “محمد رسول اللہﷺ قرآن و تاریخ کے آئینے میں ”، امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی کتاب “رسول رحمت”، مولانا پروفیسر محمد اجمل کی کتاب “رسولِ عربی”، ڈاکٹر الطاف جاوید کی کتاب “انقلابِ مکہ، سیرت نبوی نزول قرآن کی روشنی میں ”، مولانا وحید الدین کی کتاب “پیغمبرِ انقلاب” اور ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتاب “پیغمبر اعظم و آخر ﷺ” اردو زبان کی قابلِ ذکر کتابیں ہیں ۔ اس میں اوّل الذکر چار کتابیں مقاصدِ نبوت اور قرآنی فکر کا جامع علمی استفادہ ہیں اور آخر الذکر دونوں کتابیں طریقۂ نبوت کا عمدہ بیان ہیں ۔ موجودہ دور

کے ان محققین کے لیے جو اسلام کے ربانی، سماج وادی، انقلابی فکر سے آشنا ہیں ، سیرت کے اساسی مآخذات کے ساتھ مذکورہ کتابیں ایک مبسوط جامع سیرت لکھنے کے بہتر عصری ماخذ ہیں ۔

حال ہی میں کراچی میں قائم حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ میں قرآن حکیم کی اعلیٰ تعلیم کے کورسز کےلیے ایک جامع سیرت کی کتاب کی ضرورت پیش آئی تو شیخ الاسلام مولانا محمد میاں ؒ اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی سیرت پر تحقیق کی گئی دو کتابوں کے اختصار اور حکیم الاسلام مولانا عبیداللہ سندھی کی تفسیر سے اشاراتِ سیرت کا انتخاب کرکے یہ "جوامع السیرۃ" کتاب مرتب کی گئی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ کے طلبہ کے علاوہ سیرت النبی کے موضوع پر دیگر محققین و قارئین کے لیے بہتر استفادہ کا ذریعہ بنے گی۔ اور یہ کوشش اس روایت کی بنیاد بنے گی کہ سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ صرف و محض برکت حاصل کرنے کا ذریعہ نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی روشنی میں تبدیلی کےلیے اپنے کردار کا تعین کیا جائے اور اس ضمن میں اس سے رہنمائی حاصل کی جائے اور اس طرح اسلامی انقلاب کی اساس و استحکام کے فکری و عملی ، اجتماعی طریقوں کا شعور پختہ کیا جائے۔ اس وقت اسلامی دنیا میں اسلامی تحریکیں جس اضطراب اور فکری

کشمکش سے گزر رہی ہیں ، ایسے میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت اور اسلامی انقلاب کی ربانی، سماج وادی بنیادیں ان تحریکوں کےلیے روشنی کے مینار ہیں ۔ اگر اندھی تقلید اور روایتی عقیدتوں کو ترک کرکے تبدیلی کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کیا جائے اور ایمان کے قرآنی معیار کو حاصل کیا جائے تو اسلام کی ترویج اشاعت اور فروغ کے امکانات روشن سے روشن تر ہوجائیں گے۔ اگر مسلمان بھٹکتی انسانیت کو اب بھی ربانی، سماج وادی نظام کی برکتوں سے فیضیاب کرنے کی ذمہ داری سے محروم رہتے ہیں تو یہ ان کی بدنصیبی ہوگی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پوری انسانیت کے لیے بھی بڑے خسارے کی بات ہوگی اور پھر یاد رکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ ربِّ کائنات اپنا کام روکتا نہیں بلکہ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَهُمْ (محمد:۳۸) اس کا اصول ہے۔ وہ یہ کام کسی اور افراد اور ذریعہ سے بھی کرسکتا ہے۔

ابوالفضل نور احمد
ڈائریکٹر
حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

محمد رسول اللہ
ﷺ

قرآن و تاریخ کے آئینہ میں

(اختصار کے ساتھ)

محدث کبیر، مورخ اسلام، مجاہد ملت

حضرت مولانا سید محمد میاں

مَکّہ

محل وقوع اور اہمیت

دنیا کے وہ مقام جن کو بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں درمیانی کڑی (جنکشن) کی حیثیت حاصل تھی مکہ ایسے ہی مقامات میں ایک ممتاز مقام تھا۔

مکہ شہر بعد میں آباد ہوا مگر اس کے محل وقوع کی یہ حیثیت اس وقت سے تھی جب سے ہند، سندھ،افغانستان، ایران، یمن اور شام کے ممالک تمدن سے آشنا ہوئے تھے اور ابن آدم کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے اجناس و مصنوعات کے تبادلے کا سلسلہ ایجاد کیا تھا ۔

عرب کا یہ صوبہ جس میں مکہ شہر ہے اس کو حجاز کہاجاتا ہے کیونکہ یہ صحرا ءِ اعظم کے ریگ و بالو اور دوسمندروں (بحراحمر و بحر قلزم) کی موجوں کے درمیان قدرتی آڑ[1] (حجاب) ہے ۔ حجاز نے بے شک سمندر کو صحراءعرب اور اس کے شمال مشرقی شہروں سے کئی سومیل دور ہٹادیا، مگر سمندر کا یہ قدرتی احسان ہے کہ اس نے حجاز کے ساتھ علیحدگی پسندی کا سلوک نہیں کیا بلکہ پہلے تو عربوں

---

[1] حجاز کے معنی آڑ ہیں ۔

کوجہاز رانی سکھائی پھر ان کے جہازوں کو اپنے سینے پر چڑھاکر نہ صرف یمن، سندھ، مصر ، افریقہ اور ایران بلکہ دنیا کے مشرقی کناروں (جزائر شرق الہند) تک پہنچایا۔ حجاز جس کا قلب مکہ ہے اس کی یہی اہمیت تھی جسکی وجہ سے اس پر قبضہ کے لئے تین اہم عصر سلطنتوں میں رقابت چلی آئی تھی (رومی ، ایرانی اور حبشی) یہ تینوں اس پر قبضہ کے خواہشمند رہیں ۔

روایت ہے کہ سکندر ذوالقرنین نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد "خانہ کعبہ" کی زیارت کرے[2]۔ جدہ جو مکہ سے صرف پچاس میل کے فاصلہ پر حجاز کی بندرگاہ ہے جو فی زمانہ حجاج ہند کے استقبال کا عادی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب نوع انسان کا گلہ وجود وحیات کی پہلی منزل میں تھا تو جدہ نے حضرت آدم علیسلم اور ان کی اہلیہ محترمہ (حضرت حوا) کا استقبال بھی اسی شان سے کیا تھا جب وہ لنکا سے روانہ ہوکر ہندوستان سے گزرتے ہوئے سرزمین حجاز میں فروکش ہونے کے لئے مکہ جارہے تھے۔ جہاں انہوں نے پہلی بار خانہ خدا کعبہ کی بنیاد رکھی۔ یہ کعبہ طوفان نوح میں اٹھالیاگیا تھا پھر حضرت ابراہیم علیسلم نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا۔ (بحوالہ عہد زرین جلد اول)

بناءمکہ، بانی مکہ اور کعبہ

---

[2] البدایہ والنہایہ ص ۱۰۵، ج ۲ ۔

تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیسلم[1] نے شام سے آکر علاقہ حجاز کی ایک وادی غیرزرع (بنجر میدان) میں اپنے جگر گوشے اسماعیل علیسلم کو آباد کیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد خدا کے گھر کی مٹی ہوئی بنیادیں ابھاریں ۔ اس خانے خدا کا نام کعبہ ہے۔ اور جو شہریہاں آباد ہوا وہ مکہ ہے۔ ۔

اس نونہال (حضرت اسماعیلعلیسلم) کے ساتھ صرف اس کی ماں تھی۔ وہی اس چشمے کی مالک تھی جو یہاں ان کی سکونت کے ساتھ ساتھ[2] برآمد ہواتھا ۔

یہ چشمہ برآمد ہوا تو ہاجرہ علیھلسلم سے اجازت لے کر یہاں قبیلہ جرھم[3] بھی آباد ہوگیا

---

[1] ہندوستان کی جنتا برہم کو پوری عظمت کے ساتھ مانتی ہے۔ مگر یہ نہیں بتاسکتی کہ "برہم"۔ کون تھے۔ کوئی انسان تھے تو کہاں کے رہنے والے تھے اور ان کا مذہب و مسلک کیا تھا۔ مگر بائبل برہام، اور ابرہام کو موجودہ نسل انسانی کا باعظمت انسان، توحید کا علم بردار اول اور ان مذاہب کا ہادی اعظم مانتی ہے۔ جو الہام، وحی اور نبوت رسالت کے قائل ہیں ۔ قرآن حکیم نے بھی حضرت ابراہیم کو یہی حیثیت دی ہے۔

[2] حضرت ابراہیم علیسلم نے اپنی بیوی اور لخت جگر کو یہاں آباد کیاتو تھوڑے سے کھجور اور پانی کا ایک مشکیزہ توشہ میں دیا تھا چند روز بعد پانی ختم ہوگیا ماں سے پہلے بچہ پیاس کی وجہ سے لب دم ہوگیا تو قدرتی طور پر ایک چشمہ برآمد ہوگیا اسی کا نام "زمزم" ہے۔ جو اب خانہ کعبہ کے قریب کنویں کی شکل میں ہے ۔

[3] اس قبیلہ کا اصل وطن یمن تھا۔ اب وہ الگ سرزمین اپنی آبادی کے لئے چاہتا تھا۔ یہ میدان اور چشمہ اس کے

تھا۔ حضرت اسماعیلعلیسلم جوان ہوئے تو ان کی شادی بھی اسی قبیلے میں ہوگئی ۔

حضرت اسماعیلعلیسلمکی اولاد ہوئی تو عرب قدیم میں ایک نئی نسل کا اضافہ ہوگیا جس کوعرب مستعربہ[4] اور بنو اسماعیل کہاگیا ۔

حضرت اسماعیل علیسلم یہاں تنہا تھے۔ ایک ماں کے علاوہ نہ ان کا کوئی دادھیالی رشتہ دار تھا نہ نانھیالی۔ حضرت اسماعیلعلیسلم خدا کے نبی تھے۔ نبی کی اخلاقی اور روحانی تربیت خود قدرت کی جانب سے ہوتی ہے۔ اور نظر بظاہر حضرت ابراہیمعلیسلم مربی تھے وہ یہاں آتے رہتے تھے۔ بنو جرہم سے ان کو سماجی راہ و رسم کی مدد ملی اور ادھر بنو جرہم پر حضرت اسماعیل علیسلم کے اخلاق کا یہ اثر ہوا کہ وہ ان کے معتقدہوگئے۔ پھر ان کا مسلک قبول کرلیا ۔ توریت کی روایت کےبمو جب حضرت اسماعیلعلیسلم کی عمر ایک سو سینتیس ۱۳۷ سال ہوئی۔ [5] اس عرصہ میں مکہ چند گھر کی آبادی کے بجائے پورا شہر بن چکا تھا اور کعبہ نے بھی مرکزی عبادت گاہ کی حیثیت اختیار کرلی تھی ۔ حضرت اسماعیلعلیسلم اپنی قوم کے

لئے نعمت غیر مترقبہ تھا جس نے اس قبیلے کی مراد پوری کردی۔

[4] یعنی جو پہلے عرب نہیں تھے اب عرب بن گئے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کیوں کہ حضرت ابراہیم علیسلم اگرچہ عربوں کی طرح اولاد سام میں سے تھے۔ مگر ان کا اصل وطن عراق تھا۔

[5] توریت (بائیبل قدیم) باب پیدائش ب ۲۵، فقرہ ۱۶، ۱۷

مقتدا بھی تھے اور کعبہ کے متولی بھی۔

حضرت اسماعیل علیسلم کے بارہ لڑکے ہوئے۔[2] اگر وہ سب مکہ میں رہتے تو بہت ممکن تھا مکہ میں ان کی اکثریت ہوجاتی مگر یہ صاحبزادگان جو اولولعزم نبی کی اولاد تھے ان کا مطمح نظر اور نصب العین دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق تھا۔ وہ اسی مقصد کو لے کر مکہ سے نکلے اور ملک کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے۔ جہاں جہاں وہ پہنچے وہاں اس زمانہ کی گمراہیوں یعنی کواکب پرستی اور اصنام پرستی وغیرہ کے مقابلہ میں خدا پرستی کا علم بلند ہوگیا۔[3]

مکہ میں حضرت اسماعیل علیسلم کے صرف ایک فرزند قیدار قیام پذیر رہے ۔ حضرت اسماعیل علیسلم کے بعد وہ ہی خانہ کعبہ کے متولی ہوئے۔ پھر ان کی اولاد متولی ہوتی رہی اور سیاسی اقتدار ان کے نانھیال "بنوجرھم" کو حاصل رہا۔ کئی صدی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ وقت آیا کہ بنو جرھم اپنے اقتدار کے نشہ میں ایسے مست ہوئے کہ ان کو اولاد اسماعیل علیسلم کی اتنی مداخلت بھی گوارہ نہ ہوئی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی رہیں چنانچہ ان کو مکہ سے نکال دیا ۔ اور اب مرکز توحید یعنی خانہ کعبہ پر بھی انہیں کا اقتدار ہوگیا ۔

قریش اور قصی بن کلاب مصلح

---

[2] ایضاً

[3] سیرۃ ابن ہشام ص ۷۲، ج۱

قریش

قریش کا تعارف :

حضرت اسماعیل علیسلم کی اولاد میں تقریباً بیس پشت کے بعد ایک شخص مُضَرہوا ہے ۔ باپ کانام “کنانہ” اس کی اولاد کو “قریش” کہاجاتا ہے ۔

مضر کی آٹھویں پشت میں ایک شخص ہوا جس کا عرفی نام قصی تھا (اصل نام زید، باپ کا نام کلاب، ماں کا نام فاطمہ بنت سعد) قصی بن کلاب کو قوم نے مُجَمِّع کا خطاب دیا ۔ اس کی پانچویں پشت میں فخر موجودات، سیدالانبیاءمحمد رسول اللہﷺ کا ظہور اقدس ہوا ۔ سلسلہ نسب یہ ہے : محمدﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف بن قصی ۔

قصی اور تولیت کعبہ :

قصی بچپن ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہوگیا تھا ماں نے قبیلہ بنی عذرہ کے ایک شخص سے جس کانام ربیعہ بن حرام تھا دوسرا نکاح کرلیا ۔ بنو عذرہ، شمال عرب کے حدود میں شام کے قریب سرغ میں آباد تھے۔ قصی نے ماں کی آغوش میں یہیں پرورش پائی ۔ ہوش سنبھالا تو وطن اور نسل کی جستجو ہوئی ۔ کچھ سراغ لگاتو یہ مکہ پہنچا ۔ وہاں بڑے بھائی سے ملاقات ہوئی جس کانام زہرہ تھا ۔ جو بوڑھا ہوچکا تھا اس کی بصارت بھی جاتی

رہی تھی ۔ [1]

مکہ پر بنو جرھم کے بعد اب قبیلہ خزاعہ کا قبضہ تھا۔ قصی نے یہیں بودوباش شروع کردی اور یہاں تک تعلقات بڑھائے کہ خانہ کعبہ کے متولی [2] نے اپنی لڑکی کا نکاح قصی سے کردیا ۔ قصی نے قریش کے انتشار کو ختم کرکے ان کو ایک مرکز پر جمع کیا، اس لئے اس کا لقب[3] مجمع ہوگیا۔[4] قص بنو خزاعہ کے مقابلہ پر ایک مضبوط محاذ قائم کرکے چند ایک مقابلوں کے بعد قریش کا مکہ پر تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس طرح کئی ہزار سال کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھاکہ بنو اسماعیل کو مکہ پر سیاسی اقتدار حاصل ہوا ۔

سیاسی رابطہ :

شام کے قریب جو عربی قبائل آباد تھے اگرچہ وہ خود مختار تھے مگر باز نطینی شہنشاہیت (سلطنت روم) کے زیر اثر تھے ۔ کچھ قبیلوں نے عیسائی مذہب بھی قبول کرلیا تھا ۔ قصی اس علاقہ میں بڑھ کر جوان ہوا تو اس کی بلند پرواز فطرت نے اس کو شہنشاہ روم تک پہنچادیا۔ بنو خزاعہ کی جنگ میں قیصر روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت بھی

---

[1] ابن سعد ص ۳۷، ج۱

[2] حلیل بن حبشیہ خزاعی، لڑکی کا نام حبی، البدایہ والنہایہ ص ۲۱۰، ج۲

[3] معارف ابن قتیبہ

[4] ابن سعد ص ۴۰، ج۱

قصی کو حاصل تھی اور بقول ابن قتیبہ قیصر روم نے اس کو کمک بھی پہنچائی تھی[5] یہ بھی ایک گٹھ جوڑ تھا ۔

بین الاقوامی سیاست کبھی بھی اپنے مفادات کے تحفظ سے آزاد نہیں رہی ہے۔ بظاہر منشاءیہ بھی تھا کہ عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندوستان سے خشکی کی راہ سے ہونے والی تجارت کے گذرگاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے ۔

قصی نے مکہ پر قبضہ کیا تو شہر مکہ کی تعمیر جدید کا منصوبہ بھی تیار کیا ۔ کعبہ کے اطراف میں موجود اس جنگل کو صاف کرایا جو خانہ کعبہ کے احترام میں جھاڑیوں کی صورت میں صدیوں سے موجود چلا آرہا تھا۔ لوگوں کے وہم کو دور کرنے کے لئے سب سے پہلے خود کلہاڑا چلایا اور اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ہمارا مقصد آبادی ہے ۔ بربادی مقصود ہوتو بے شک درخت کاٹنے ممنوع ہیں ۔[6] پھر ایک خاص نقشہ کے ساتھ مکہ کو آباد کرنا شروع کیا ۔ خالی اراضی کے پلاٹ بنائے اور قریش کے ہرایک خاندان کو ایک پلاٹ دے دیا ۔ یعنی ہر قبیلہ کی الگ کالونی آباد کردی۔ انہیں کالونیوں کے محل وقوع کے لحاظ سے قریش ظواہراور قریش بطاح کی اصطلاحیں ایجاد ہوئیں ۔[7]

---

[5] داعانہ قیصر علیہا، معارف ابن قتیبہ ص ۲۱۵ ملوک الشام

[6] ابن سعد ص۴۰ج۱

[7] ابن سعد ۴۰ ج۱

اس عقیدے کو بھی ختم کیاکہ خانہ کعبہ کے قریب مکان نہ بنائے جائیں بلکہ قریش کے کچھ خاندان یہاں آباد کئے اور کچھ خاندان شہر کے بیرونی حصے میں ۔ البتہ یہ ہدایت کردی کہ کعبہ کے قریب دوسری منزل تعمیر نہ کی جائے ۔[3]

اس جدید نقشے میں خانہ کعبہ وسط میں رہا ۔ خانہ کعبہ کے گرد بہت وسیع میدان چھوڑ دیا گیا۔ محلوں (کالونیوں) کے بیچ میں راستے رکھے گئے ۔ یہ راستے (سڑکیں) خانہ کعبہ کے میدان پر آکر ختم ہوتے تھے ۔ ان میں وہ سڑک بھی تھی جس کو "طریق ابی شیبہ" کہاجاتا تھا ۔ یہ سڑک بہت وسیع اور سب سے زیادہ چالو تھی ۔

وہی قصی جس کا بچپن یتیمی میں گذرا تھا اس انقلاب کے بعد اپنی قوم کا سب سے بڑا شخص تھا ۔ وہ گویا پوری قوم کا مالک تھا جس کی عظمت دلوں کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی تھی۔[4] یہاں تک کہ لوگ اس سے برکت حاصل کیاکرتے تھے ۔

قوم کے پاس پہلے سے کوئی دستور العمل یا قانون نہیں تھا تو اسی کا قول قانون ہوتا تھا۔ اور نہ صرف زندگی میں بلکہ بقول ابن سعد اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے قول کی ایسی ہی تعظیم کی جاتی تھی جیسے کسی مذہبی

---

[3] احمد السباعی ص ۴۴
[4] ابن سعد ص۴۰ ج۱

حکم کی[۹] مگر نہایت عجیب اور دور حاضر کے سیاست دانوں کے لئے بہت زیادہ قابل قدر اور سبق آموز بات یہ ہے کہ اس تمام عظمت اور اقتدار کے باوجود قصی نے نہ تاج شاہی سرپر رکھا نہ اپنے آپ کو بادشاہ کہلوانا پسند کیا ۔ اس نے اپنے رسمی اعزاز اور اپنی وجاہت و عظمت کے مقابلہ میں ابراہیمی عظمت توحید اور قوم کی روایات اور ان کے اطوار کا احترام کیا۔ حریت اور آزادی اس قوم کا وہ جوہر تھا جس نے کبھی بھی کسی شاہ یا شہنشاہ کے سامنے اس قوم کی گردن نہیں جھکنے دی تھی۔ قصی نے تخت سلطنت اور تاج شاہی کے مقابلہ میں اس جوہر کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کی۔ اس سے بڑھ کر اپنی قوم کے ساتھ اخلاص کیا ہوسکتا ہے کہ اس نے دربار شاہی کے بجائے دارالندوہ تعمیر کیا اور اس کا ایسا نظام بنایا جس کے لئے جمہوری کے علاوہ اور کوئی لفظ مناسب نہیں ہوسکتا۔ جس میں فرد یا شخص کی نہیں بلکہ نظام کی تعظیم تھی اور ملوکیت یا شخصی اقتدار سے یہاں تک اجنبیت تھی کہ نہ دارالندوہ کا کوئی صدر (چیئرمین) تھا نہ اس جمہوری نظام میں صدر کا کوئی عہدہ تھا ۔ بہت سے فرائض ، پورٹ فولیو تھے جو مختلف قبائل پر تقسیم کردیئے گئے تھے۔ قبیلہ کا سربراہ اس فریضہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

---

[۹] ابن سعد ص ۳۹ ج۱

مکہ کی شہری ریاست

جدید تنظیمات

نادی ۔ دارالندوہ ۔ شعبے اور منصب

دیہات میں اور قصبات کے محلوں میں ایسے مکانات ہوتے ہیں جن کو چوپال کہاجاتا ہے ۔ یہ عموماً محلے یا گاؤں کے بڑے آدمی کی حویلی کا مردانہ حصہ ہوتا ہے جس میں گاؤں یا محلے والوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ کوئی تقریب منائیں کوئی مشاورتی اجتماع یا تفریحی مجلس کریں ۔ چوپال میں وعظ کے جلسے بھی ہوتے ہیں بیاہ شادی کی تقریبات بھی ۔ مشاعرے اور ادبی مجلسیں بھی ہوتی ہیں اور کبھی رقص و سرود کی رنگین محفلیں بھی جمتی ہیں ۔ (جدید دور میں کمیونٹی سینٹر اس کے متبادل بنے ہیں ۔)

چوپال ایک بڑا ہال ہوتا ہے اور موجودہ زمانے میں بھی عموماً دیہات میں یہ ہال خام ہوتا ہے یعنی دیواریں مٹی یا کچی اینٹوں کی ہوتی ہیں اور چھت کڑیوں کی ۔ بیچ میں شہتیر (اور دور حاضر میں گاڈر) رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اوپر دوطرفہ کڑیاں ہوتی ہیں اس وجہ سے اس کو دوکڑیے بھی کہتے ہیں ۔

غالباً اسی وجہ سے مدینے والے اس کو سقیفہ کہتے تھے مگر مکہ معظمہ میں اس کے لئے نادی[1] کا لفظ استعمال ہوتا تھا ۔

نادی (مقاصداور فوائد)

جوکام ہمارے یہاں چوپالوں میں ہوتے ہیں وہ ان اندیہ (نادیوں) میں بھی ہوا کرتے تھے۔ اس پر مستزادیہ کہ :

(۱) سلسلہ نسب کے بارے میں کوئی اعلان ہوتا تھا تو وہ ان نادیوں میں کیا جاتا تھا۔

(۲) قبیلہ میں داخل کرلینے کا ایک خاص قاعدہ اور رواج تھا۔ جس کو داخل کرتے تھے وہ مولی کہلاتا تھا اور جو معاہدہ اس سے ہوتا تھا اس کو عقدموالات کہاکرتے تھے ۔ یہ عقد موالات نادیٔ ہی میں ہوتے تھے ۔

(۳)عقد موالات کے برعکس خلع یا طرد کا اعلان بھی اسی نادیٔ میں ہوتا تھا یعنی جس کو مولیٰ بنایا گیا تھا اگر وہ معاہدہ کی پابندی نہ کرتا یا اپنے عمل اور کردار میں غلط ثابت ہوتا تو اس کو قبیلہ سے خارج بھی کیاجاسکتا تھا ۔ اس کو خلع کہتے تھے (الگ

---

[1] نادیہ ندیٌ سے ماخوذ ہے۔ نَدی کے معنی ہیں رطوبت، تراوٹ اسی سے نداءبمعنی آواز بھی ماخوذ ہے کہ جس کے حلق میں تراوٹ زیادہ ہوتی ہے اس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ نادی، میں جام و سبو کی تراوٹ بھی رہا کرتی تھی اور داد و دہش کی سیرابی بھی اور جس طرح بحث و مباحثہ میں آوازیں بلند ہوتی تھیں ، شعراءکے ترنم اور مغنیوں کے طرب انگیز نغمے بھی ہوتے تھے۔ یہی مناسبتیں وجہ تسمیہ ہی۔

کردینا)۔ اور طرد کا لفظ بھی اس کیلئے استعمال کرتے تھے (دھکے دے کر نکال دینا)۔ یہ شخص خلیع، مخلوع یا مطرود کہلاتا تھا۔

(۴) خریدوفروخت کے اہم معاملات تجارتی کاروانوں کا استقبال اور ان کی روانگی کی تقریب ۔

(۵) تفریحی مجلسیں ، رات کو قصے خوانی (مسامرے) رقص و سرود اور سوانگ (ڈرامے) بھی نادیٔ میں ہوا کرتے تھے ۔

نظم و نسق کے لحاظ سے یہ نادی قبیلے کی ہیئت حاکمہ اور شیخ قبیلہ کی اجتماعی طاقت ہوتی تھی۔ ہر ایک نادی کے ساتھ ایک اعلانچی بھی ہوتا تھا جس کو موذن، منادی یا نقیب کہاکرتے تھے ۔

دارالندوہ :

قبیلہ وار نظام کی طرح پورے شہر کا کوئی مرکزی نظام نہیں تھا۔ ضرورت کے وقت عام اجتماع ضرور ہوجاتے تھے مگر ان کا کوئی ضابطہ تھا ،نہ کوئی جگہ ان کے لئے متعین تھی۔ مصلح قصی کا قابل فخر کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شہری اجتماع کا ایک نظم اور ضابطہ مقرر کیا۔ اپنا مکان جو اس نے کعبے کے شمالی میدان میں اس طرح بنایا تھا کہ اس کا دروازہ مسجد حرام کی طرف تھا، مرکزی نظام کے لئے عام کردیا اور دارالندوہ اس کا نام رکھا ۔

دارالندو ہ کے ضابطے :

ندوہ کمیٹی یا مجلس کو کہتے ہیں ۔ یہ کمیٹی جس کے نام پر یہ دارالندوہ تھا اس کی تشکیل کا ضابطہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ قیاس یہ ہے کہ قبائلی مجالس (نادیٰ) کے شیوخ اور سربراہ اس کے ارکان ہوتے تھے۔ البتہ ارزقی نے اخبار مکہ[1] میں اور ابن درید نے کتاب الاشتقاق[2] میں تصریح کی ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم سے کم چالیس سال ہوتی تھی۔ صرف دارالندوہ کے بانی (قصی) کی اولاد اس شرط سے مستثنیٰ تھی [1]

اجلاس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا جب ضرورت ہوتی اجلاس کرلیاجاتا تھا۔ دارالندوہ کا منتظم اجلا س کا داعی ہوتا تھا، صدر کوئی مقرر نہیں تھا ۔

دارالندوہ میں انجام پانے والے کام :

(۱) شہر مکہ اور قوم قریش سے تعلق رکھنے والے معاملات کے متعلق مشورے اور فیصلے[2] (۲) کسی قبیلے یا گروہ سے جنگ یا صلح کے فیصلے (۳) مدافعتی تدابیر (۴) جنگ کے وقت علمبردار کا تقرر (۵) تجارتی معاہدات (۶) بیرونی مہمانوں کا استقبال (۷) قصی کی

---

[1] اخبار مکہ ص۱۰۷ ج۱
[2] کتاب الاشتقاق ص۹۷
[1] کتاب الاشتقاق ص۹۷
[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کردینے کا فیصلہ بھی یہیں کیاگیا تھا ۔

شخصیت سے برکت حاصل کرنے کے لئے شادی کی تقریبات بھی یہاں ہوا کرتی تھی (۸) قافلوں کی روانگی اور واپسی پر ان کا استقبال بھی یہاں ہوتا تھا ۔ (۹) ایک خاص رسم رائج تھی کہ جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچ جاتی تھی تو اس کو درع پہنایا جاتا تھا (بڑا کرتا) اور چھوٹا کرتا اترادیا جاتا تھا ۔ یہ رسم بھی یہاں انجام دی جاتی تھی[3] (۱۰) قومی ملکیت کی چیزیں بھی یہیں محفوظ کردی جاتی تھیں ۔[4]

مختلف شعبے اور منصب

مکہ جو صرف ایک شہر یا ایک آزاد ریاست نہیں بلکہ پورے عرب کا متبرک مرکز بھی یہی تھا، جہاں عرب کا مرکزی معبد کعبہ تھا۔ اس کے انتظامات کی جو صورتیں پہلے تھیں قصی نے ان کو باقی رکھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے شعبے قائم کئے، ان کے منصب اور منصبدار (عہدے دار) مقرر کئے، کچھ شعبے اپنے پاس رکھے ۔ تفصیل یہ ہے :

(۱) دارالندوہ۔ اس کا نظم و نسق مستقل شعبہ تھا جو قصی سے متعلق تھا اس کے بعد عبدالدار سے متعلق ہوا ۔

(۲) مشورہ۔ یعنی مشاورتی اجتماع کا

---

[3] سیرۃ ابن ہشام ۱۷۹، ابن سعد ص ۳۹، ج۱

[4] مثلاًغزوہ احد کی تیاری کے لئے جو تجارتی مال لایا گیا تھا اس کا نفع جنگ میں صرف کیاجائے گا وہ مال یہیں جمع رکھاگیا تھا ۔ (ابن ہشام وغیرہ)

انتظام

(۳) حجابت کلید برداری یعنی کھولنے اور بند کرنے کی ذمہ داری اور خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونے کی اجازت دینے کا اختیار ۔

(۴) سدانت ۔ دربانی، کھولنے بند کرنے اور صاف رکھنے کی خدمت یہ کوئی مستقل منصب نہیں تھا بلکہ منصب حجابت ہی سے متعلق تھا ۔

(۵) حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی، اس منصب کا ذمہ دار یہ نگرانی بھی رکھتا تھا کہ حرم میں شورو غل یا جھگڑا فساد نہ ہو ۔

(۶) ایسار[1] بتوں سے استخارہ یعنی فال لینا جس کا قاعدہ مقرر تھا ۔

(۷) اموال محجرہ یعنی محفوظ مال ۔ خانہ کعبہ کو جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے ان کی حفاظت کا شعبہ ۔

خانہ کعبہ میں ایک پختہ گڑھا کنوئیں کی طرح تھا، چڑھاوے کی طلائی اور نقرئی چیزیں اس کنوئیں میں ڈال دی جاتی تھیں ۔ اسی کنویں کے کنارے پر صنمخانہ کعبہ کا سب سے بڑا بت ہُبل تھا۔

حج سے متعلق :

---

[1] اس کا ماخذ میسر ہے۔ میسرہ کے معنی قمار اور جوا (قاموس) چھوٹے چھوٹے تیر جن کو ازلام کہاجاتا تھا۔ وہ جوا کھیلنے کے کام میں آتے تھے۔ انہیں کے ذریعہ فال بھی نکالا جاتا تھا۔

رفادہ ۔ حجاج کے کھانے کا انتظام :

قصی کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ جب اس نے قریش کو مکے میں آباد کیا تو ان کے ذہن نشین کرایا کہ آپ محافظ اور خادم کعبہ ہیں ۔ زائرین جو عرب کے کونے کونے سے آتے ہیں یہ آپ کے مہمان ہونے چاہئیں اور ان کے خوردونوش کا انتظام آپ کو کرنا چاہیئے۔ یہ قریش کی عالی حوصلگی تھی کہ انہوں نے اس تجویز کو منظور کیا ۔ اور پھر یہ طے ہوگیا کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس مقصد عظیم کے لئے جمع کرادیاکرینگے ۔ تجارتی مال میں یہ حصہ کم سے کم عشر (دسواں حصہ) ہوتا تھا۔ بعض باحوصلہ اس سے بھی زیادہ دیدیا کرتے تھے ۔ اس تجویز کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ :

(۱) عام عرب بنو خزاعہ کو بھول گئے جن سے قصی نے اقتدار چھینا تھا ۔

(۲) قریش کے تسلط کو نعمت اور رحمت سمجھنے لگے ۔

(۳) شہر مکہ اور حرم کعبہ میں قصی نے جوانقلاب برپا کیا تھا کہ عرب کے عقیدے کے خلاف جھاڑیاں اور درخت کٹواکر قریش خاندان آباد کردیئے ۔ عرب نے اس کو برداشت کیا ۔ فریق مخالف (خزاعہ) جو اس کے خلاف پروپیگنڈے کرکے عرب کو مشتعل کرسکتے تھے اس کے راستے بند ہوگئے ۔ اس طرح خطرات ختم ہوگئے ۔

(۴) نہ صرف سرزمین مکہ میں بلکہ پورے عرب میں قریش کے لئے کوئی خطرہ نہیں

رہا۔ چنانچہ عام عرب کے لئے صرف چار ماہ حرم میں ان کو کہیں آنے جانے میں خطرہ نہیں ہوتا تھا اور قریش کے لئے پورے بارہ مہینے حرم ہوگئے ۔ اس سے بسل کی اصطلاح ایجاد ہوگئی ۔ یعنی باقی آٹھ ماہ کا بھی حرام ہونا ۔

یہ قریش کا اعلیٰ درجہ کا تدبر تھا کہ رفادہ کے باعث انہوں نے خرچ سے زیادہ منافع کی صورتیں پیدا کرلیں اور ان کے عظمت و احترام میں بھی چار چاند لگ گئے۔ پھر احرام کا انتظام بھی قریش نے اپنے ذمہ لے لیا ۔ یعنی جب عرفات سے واپس ہوکر طواف کعبہ کریں جو ۱۰ تا ۱۲ ذی الحجہ کو ہوا کرتا تھا تو یہ طواف ان کپڑوں میں نہ ہونا چاہئے جو سال بھر پہنے جاتے ہیں ، جن کو پہن کر سینکڑوں گناہ کئے جاتے ہیں ۔ بلکہ اس طواف کے لئے احرام کا کپڑا قریش دینگے اور اگر کوئی شخص کسی وجہ سے قریش کا یہ عطیہ حاصل نہ کرسکے تو وہ برہنہ بدن طواف کرے۔[۵]

سقایہ :

حجاج کے لئے پانی کا انتظام۔ یہ شعبہ بھی رفادہ کی طرح بہت اہم اور بہت کٹھن تھا۔

خزاعہ سے شکست کھاکر جب بنو جرھم مکہ سے فرار ہوئے تو ان بھاگنے والوں نے سب کچھ تباہ کردینے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے زمزم کو بھی (جو پہلے چشمہ تھا پھر یہاں کنواں

---

۵ ابن سعد ص۴۱ ج ۱

بنالیا گیا تھا اور چشمہ کنویں کا سوت ہوگیا تھا جس کی وجہ سے کنویں کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا تھا) نے صرف بند کردیا تھا بلکہ لاپتہ کردیا تھا۔ قصی نے جب کعبہ کا حرم بنایا اور اس کے قریب قریش کو آباد کیا تو یہاں کوئی کنواں نہیں تھا تو زائرین کے لئے پانی کی سخت دشواری ہوتی تھی ۔ شعبہ سقایہ کا کام یہ تھا کہ مکہ کے مختلف محلوں میں جو کنویں تھے وہاں سے پانی لاتے اور حوضوں میں بھردیتے تھے ۔

زائرین صرف حرم کعبہ ہی میں نہیں رہتے تھے بلکہ عرفات اور مزدلفہ بھی جاتے تھے ۔ اور منیٰ میں تو کئی روز تک جشن رہا کرتا تھا۔ پانی کا انتظام سب جگہ کیا جاتا تھا۔ واٹر پروف قسم کی چیز اس وقت نہیں تھی البتہ چمڑے ان کے یہاں ہوتا تھا جو حبش وغیرہ بھی بھیجا جاتا تھا۔ بڑے بڑے حوض چمڑے[2] ہی کے بنائے جاتے تھے یہ سب انتظام شعبہ سقایہ سے متعلق تھا۔

وقادہ :[3]

۹ذی الحجہ کی شام کو حاجی عرفات سے روانہ ہوکر مزدلفہ پہنچتے ہیں ۔ رات کو مزدلفہ میں قیام رہتا ہے۔ صبح کو وہاں سے منیٰ آتے ہیں ۔ یہی دستور زمانہ جاہلیت میں تھا۔ یہ رات اگرچہ چاندنی ہوتی ہے۔ مگر پھر

---

[2] ابن سعد ص۴۱ ج ۱

[3] وقادہ: آگ روشن کرنا بمعنی وقود

بھی قصی نے یہ انتظام کیاتھا کہ مزدلفہ کے ٹیلوں پر آگ جلائی جاتی تھی جس سے میدان مزدلفہ روشن رہتا تھا اور آنے والوں کو سہولت ہوتی تھی [۵]اس کو وقادہ کہاجاتا تھا۔

اجازہ یا افاضہ :

روانگی کا پروگرام بنانا ۔ پہلے گزرچکا ہے کہ یہ اختیار "صوفہ" کو حاصل تھا کہ وہ طے کیا کرتے تھے کہ مثلاً عرفات سے کونسا قبیلہ پہلے اور کونسا بعد کو روانہ ہوگا ۔

قُبّہ

حج کے موقع پر ہر ایک قبیلہ کا قیام گاہ (پڑاؤ) الگ ہوتا تھا جس کو منزل کہاجاتا تھا۔ کمبلوں کے خیمے ہوتے تھے۔ مگر قریش کے خیمے سرخ چمڑے کے ہوتے تھے۔ ایسے خیمے کو قبہ کہا جاتا تھا (جمع قباب) ان کے انتظام کا ایک شعبہ تھا، اس کو قبہ ہی کہتے تھے ۔

عدالت اور فصل خصومات:

حکومت کے عام مقدمات کی سماعت اور فیصلے اس شعبے سے متعلق تھا ۔

اشناق ۔ قتل کے سلسلے میں بعض صورتیں ایسی ہوتی تھیں جن میں دیت واجب ہوتی تھی۔ دیت کی ایسی صورت ہوتی تھی کہ اس کو اجتماعی جرمانہ کہا جاسکتا ہے ۔ پوری دیت

---

[۵] ابن سعد ص۴۱ ج۱

کے سو اونٹ[2] ہوتے تھے جو مقتول کے وارثوں کو دیئے جاتے تھے۔ مگر یہ اونٹ قاتل نہیں دیتا تھا۔ بلکہ اسکی ادائیگی عاقلہ کے ذمہ ہوتی تھی۔ یعنی وہ سوسائٹی جس میں یہ رہتا تھا۔ پھر قبائل کے جومعاہدات ہوتے تھے ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہوتی تھی کہ اگر کسی قبیلہ پر دیت اداکرنی لازم ہو تو اس کا اتنا حصہ وہ قبیلہ ادا کرے گا اور اتنا حصہ اس کا حلیف اور معاہد قبیلہ ادا کرے گا ۔

پھر اگر جان ہلاک ہوئی ہے تو پوری دیت لازم ہوتی تھی اور اگر ناک، کان یا کوئی عضو کاٹ دیا ہے تو بعض صورتوں میں پوری دیت اور بعض صورتوں میں دیت کا ایک حصہ لازم ہوتا تھا۔ چونکہ اسلام نے بھی دیت کے طریقہ کو (جزوی اصلاحات کے بعد باقی رکھا) تو اس کے احکام کتب فقہ میں بھی ہیں ۔ بہرحال قتل و دیت کے مقدمات نہایت اہم ہوتے تھے اور ان میں فیصلہ طلب امور یہ ہوتے تھے کہ پوری دیت لازم ہوتی ہے یا دیت کا جزو۔ اور جوبھی صورت ہو اس کی ادائیگی صرف قاتل کے قبیلہ اور اس کے عاقلہ پر لازم ہوگی یا اس قبیلہ کے حلیف قبائل پر بھی۔ اور اگر حلیفوں پر بھی لازم

[2] پہلے ایک انسان کی دیت دس اونٹ ہوا کرتی تھی جب عبدالمطلب کی منت ماننے کے مشہور واقعہ مین عبداللہ کے فدیہ میں سوا اونٹ پر قرعہ نکلا اور عبدالمطلب نے عبداللہ کے فدیہ میں سو اونٹ ذبح کئے تب سے ایک انسان کی دیت سو اونٹ قرار دی گئی جس کو اسلام نے بھی باقی رکھا ۔ ابن سعد ۴۵

ہوتی ہے تو بروئے معاہدہ کتنی ہے اور اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی ۔ اس شعبہ کا نام (جس کے ذریعہ ان مقدمات کا فیصلہ کیاجاتا تھا) اشناق[1] تھا اور اس کا ذمہ دار وہی ہوسکتا تھا جو اونچے درجے کا معاملہ فہم ہو اور صحیح فیصلہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسلام سے پہلے یہ شعبہ ابوبکر بن قحافہ کے سپرد تھا، جن کو اسلام نے صدیق اکبر کا خطاب دیا۔

فوجی نظام

غیرموزوں نہ ہوگا اگر "بے ضابطہ فوج" کا لفظ استعمال کیاجائے۔ بے ضابطہ فوج سے مراد قبائل کے وہ جنگجو ہیں جو کسی بھی مقابلہ کے وقت میدان میں آجاتے تھے۔ ان کے اسلحہ[2] خود اپنے ہوتے تھے۔ ان کا کوئی کمانڈر مستقل نہیں ہوتا تھا۔ اس کا انتخاب[3] وقت پر ہوتا تھا۔

---

[1] اشناق شنق سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں جزو دیت اور زکوٰۃ کے جو نصاب اسلام نے مقرر کئے ہیں تو دو نصابوں کے درمیان جو کسر ہوتی ہے اس کو بھی شنق کہاجاتا ہے ۔ مثلاً چالیس بکریوں پر ایک بکری زکوٰۃ میں ادا کرنی ہوتی ہے اور ایک سو بیس پر دوبکریاں ، تو چالیس سے زائد اور ایک سو بیس سے کم تعداد شنق ہوئی۔

[2] تلوار، نیزہ، اور حفاظت کے لئے ڈھال، فدہ (درع) اور خود (بیضہ) خود کے آہنی جھالر جن سے گردن کی حفاظت ہوتی تھی مغفر کہلاتے تھے ۔

[3] جو عموماً قرعہ کے ذریعہ ہوتا تھا قبائل کے سردار امیدوار ہوتے تھے ۔ جنگ فجار کے موقع پر حضرت عباس ؓ کا نام نکل آیا ۔ یہ اس وقت بچے تھے تو ان کو ایک ڈھال پر بٹھاکر لے گئے ۔ العقد الفرید۴۶ ،ج۲۔

ہر قبیلے کا جھنڈا الگ ہوتا تھا اس کو لواءکہاجاتا تھا اور ایک علم پوری فوج کا ہوتا تھا اس کو عقاب کہتے تھے۔ پوری فوج کے سالار اعظم کو قائد ۔ اس منصب کو قیادت اور اس کے کیمپ کو قبے کہا کرتے تھے ۔

خاص خاص سرداروں کے ساتھ یہ عہدے اور جھنڈے سپرد کئے جاتے تھے سپرد کرنے والے بھی خاص سردار ہوتے ۔

قسمیں :

فوج کی چند قسمیں ہوتی تھیں ۔ تیرانداز، رماۃ جمع رامی، پیادے رجالہ ، سوار، خیل ۔

سوار فوج کے لئے اعنہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا ۔

فتح کے وقت لوٹ کے مال کو غنیمت کہاجاتا تھا۔ اس کا اتنا نظام تسلیم شدہ تھا کہ ایک چوتھائی قائد فوج یا سردار اعظم کا ہوتا تھا اس چوتھائی کو مرباع کہتے تھے (چوتھ)۔[1] باقی تین حصے مختلف طریقوں سے تقسیم کئے جاتے تھے۔[2] اس خاکے کے بموجب فوج کے منصب دار

---

[1] عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان بھی چوتھ سے ناآشنا نہ تھا۔ شیوا جی عالمگیر سے اس پر لڑتا رہا کہ وہ چوتھ مانگتا تھا یعنی یہ کہ عالمگیر یہ تسلیم کرے کہ شیوا جی کو اپنے میں چوتھ حاصل کرنے کا حق ہوگا ۔ سلطان عالمگیر اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

[2] عموماً تین چوتھائی باقی ساتھیوں پر اگر کچھ مال دشمن کی شکست اور عام لوٹ سے پہلے مل جاتا تھا۔ اس کو نشیطہ کہاجاتا تھا۔ فضول سے مراد ناقابل تقسیم کسرات ہوتے تھے اور صفیٰ کسی ایسی منتخب چیز کو کہتے تھے جو مہم کا سردار اپنے لئے منتخب کرلیا

یہ ہوتے تھے :
(۱) قائد اعظم (۲) علمبردار جس کے پاس عقاب رہتا تھا (۳) کیمپ یعنی قبہ کا منتظم اور محافظ (۴) سوار فوج کا سردار، صاحب اعنہ، اس کو مختصر کرکے اعنہ کہتے تھے ۔

باضابطہ فوج یا پولیس :

قریش نے حفاظتی مقاصد کے لئے ایک مستقل نظام بھی بنایا تھا اس کو قائم کہتے تھے۔ مگر اس کی حیثیت تنخواہ دار پولیس کی تھی۔ لڑائیوں کے وقت قبائل کے جنگجو بھی اپنے مفاخر کے ترانے گاتے ہوئے میدان میں آیا کرتے تھے اور مقابلے بھی ان سے کرتے تھے جو ان کے ہمسر ہوتے تھے ۔ غزوہ بدر میں سرداران قریش نے انصاری مجاہدین کو مقابلے پر دیکھا تو لڑنے سے انکار کردیا کہ یہ کاشتکار اور کسان ہیں ۔ قریش کے ہم پلہ نہیں ہیں ۔ یہ بھی ایک ضابطہ تھا ۔

قصی نے اپنے بعد عبدالدار کو جانشین کردیا اور جوشعبے قصی کے پاس تھے وہ سب عبدالدار کے حوالے کردیے ۔ لیکن قصی کے موت کے بعد اس کے دوسرے بیٹے عبدمناف کی اولاد نے مکہ کی ریاست کے شعبوں کا انتظام تقسیم کرتے ہوئے ریاست پر اپنی گرفت مضبوط کردی ۔

کارنامہ:

کرتا تھا، مثلاً کوئی تلوار یا کوئی گھوڑا وغیرہ ۔ سردار کو اس انتخاب کا حق ہوتا تھا ۔

قصی نے اگرچہ بادشاہت کا دعویٰ نہیں کیا مگر قریش پر اور قریش کے ذریعے پورے عرب پر اس کا اقتدار کسی بادشاہ سے کم نہیں تھا اور اس لحاظ سے اس کی اولاد کی حیثیت وہی تھی جو شہزادوں اور راج کماروں کی ہوا کرتی تھی ۔

عبدمناف کی اولاد نے اپنی شخصیت اور اپنی اس حیثیت کو پہچانا اور اس سے کام لیا ۔ چنانچہ انہوں نے پڑوسی ممالک کے بادشاہوں اور شاہنشاہوں سے تعلقات پیدا کئے اور ان کو بڑھایا۔ اور قابل قدر بات یہ ہے کہ ان تعلقات کے فوائد کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان تعلقات سے کام لے کر اپنی قوم کے لئے تجارتی مراعات اور سفروں میں آسانیاں پیدا کیں ۔ چنانچہ مطلب نے جو سب سے بڑا تھا شاہ حبش نجاشی اور یمن کے ملوک (ملوک حمیر) سے، ہاشم[1] نے بازنطینی شہنشاہ ہر قل سے اور نوفل نے شہنشاہ ایران کسریٰ سے اپنی قوم کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کرلئے کہ قریش تاجر جو ان کے ملکوں میں جائیں گے ان سے کوئی محصول یا ٹیکس نہیں لیاجائے گا ۔[2] ظاہر ہے تجارت پیشہ قوم کے لئے اس سے بڑی نعمت کیا ہوسکتی ہے ۔ اسی لئے ان کو مجیرون کہاجاتا تھا ۔[3]

---

[1] البدایہ والنہایہ ۲۵۳، ج۲
[2] طبقات ابن سعد ۴۳ ج۱ ، البدایہ والنہایہ ۳۵۳ ج۲
[3] ایضاً

تقسیم مناصب[1] جب آفتاب اسلام طلــوع ہوا تو مناصب کی تقسیم اس طرح تھی:

شعبہ	نمبر شمار	منصب	خدمات و فرائض	قبیلہ	منصب دار

نظم و حفـــ

[1] ماخوذ از طبقات ابن سعد ج ۱، اخبار مکہ العقدان، وسیرت ابن ہشام ج۱

فوج و جنگ	عـــــدل و انصـــــاف اور	حج اور ضروریات حجاج

امورخارجہ -

بلند حوصلہ ہاشم بن عبدمناف

رفادہ اور سقایہ سب سے اہم شعبے تھے جن کے لئے دولت کی ضرورت بھی تھی اور محنت کی بھی ۔ یہ اگرچہ عبدمناف کے چاروں بیٹوں کے سپرد ہوئے تھے مگر ان میں پیش پیش ہاشم رہا ۔ یہ سب بھائیوں میں سب سے زیادہ بلند حوصلہ، باسلیقہ، صاحب الرائے اور رساآدمی تھا۔ رفادہ اور سقایہ کو جس قدر رقم کی ضرورت تھی ہاشم کا حوصلہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا ۔

پہلے گزرچکا ہے قصی نے قریش کو سمجھایا تھا کہ زائرین (جو حج کو آتے ہیں) وہ قریش کے مہمان ہونے چاہئیں ۔

حجاج کی خدمت کیلئے دعوتوں کا یہ سلسلہ ۷ ذی الحجہ (یوم الترویہ) سے ایک دن پہلے سے شروع ہوکر ۱۴ تک رہتا تھا۔ عرفات، منیٰ اور مزدلفہ جہاں جہاں حاجی جاتے تھے یہ دعوتیں ہوتی تھیں ۔ [۵]

ہاشم کا ذریعہ آمدنی تجارت تھی۔ شہنشاہ روم (ہرقل) سے تعلقات بہت اچھے تھے۔ ایسے ہی شاہان ایران ویمن اور حبش سے تعلقات تھے ۔ اس نے ان تمام فرامین کی تجدید کرائی

---

۵ ابن سعد ص۴۵ جلد ۱

جو پہلے ہوچکے تھے اور رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیفِ (القریش۔۲)کا طریقہ اسی نے ایجاد کیا کہ قریش کا تجارتی قافلے سردیوں میں یمن اور حبش جاتا تھا اور گرمیوں میں شام سے غزہ تک اور کبھی انقرہ تک پہنچ جاتا تھا۔ یہاں کے بادشاہ اور امراءان قافلوں کا اعزاز کرتے تھے ۔[2]

مطلب ہاشم سے بڑے تھے۔ ہاشم کے بعد رفادہ اور سقایہ انہیں کے سپرد رہا مگر یہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے ۔ کچھ دنوں بعد یمن گئے وہیں "روان" میں ان کا انتقال ہوگیا ۔[3] مطلب کے بعد عبدالمطلب جانشین ہوئے ۔ یہ ان کی خدا داد صلاحیت تھی کہ ہاشم کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور چند کام ایسے کئے جن سے نہ صرف قریش یا عرب کی تاریخ متاثر ہوئی بلکہ تاریخ اسلام بھی ان سے متاثرہے ۔ مثلاً : (۱) چاہ زمزم کی برآمدگی (۲) خزاعہ سے معاہدہ (۳) دیت کے اونٹوں کی تعداد میں اضافہ (۴) اصحاب فیل کے واقعہ میں اہل مکہ کو محفوظ کرلینا۔

عبدالمطلب کے بعد خواجہ ابو طالب اور حق سقایہ

آنحضرتؐ کی عمر تقریباً ۸ سال تھی جب عبدالمطلب کا انتقال ہوا ۔ عبدالمطلب کے جانشین ابو طالب قرار دیئے گئے ۔ خدمت سقایہ ان کے سپرد ہوئی ۔ ابوطالب اخلاق اور کمالات

[2] ابن سعد ص۴۳ جلد ۱
[3] ابن سعد ص۴۵ جلد ۱

میں سب بھائیوں سے ممتاز تھے مگر دولت میں کم تھے ۔ حج کا زمانہ آیا تو ہاتھ خالی تھے اور خدمت سقایہ کے لئے دس ہزار کی ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ رقم اپنے بھائی عباس سے ایک سال کے وعدے پر قرض لی۔ دوسرا سال آگیا قرض ادا نہ ہوسکا اور مزید خرچ کی ضرورت پیش آگئی تو بھائی عباس سے پھر ایک سال کے لئے چودہ ہزار قرض لئے ۔ مگر اس مرتبہ عباس نے یہ طے کرلیا کہ اگر آئندہ سال تک یہ رقم ادا نہ ہوسکے تو آپ خدمت سقایہ میرے حوالہ کردیں ۔ خواجہ ابوطالب نے یہ شرط منظور کرلی ۔ پھر یہ اتفاق ہوا کہ ابوطالب ادائیگی قرض کا انتظام نہ کرسکے تو حسب وعدہ خدمت سقایہ عباس کے حوالہ کردی۔[5] آنحضرتﷺ نے اس کا احترام فرمایا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد بھی یہ خدمت سقایہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے نام پر ہی باقی رکھی۔

پورے عرب پر قریش کا ہمہ گیر اثر

نظام بت پرستی :

پورے عرب کو چند منطقوں پر تقسیم کیاگیا تھا۔ ہر ایک منطقہ کا بت الگ ہوتا تھا۔ اس کا مندر الگ ہوتا تھا جس کے ساتھ اس کے تمام لوازمات ہوتے تھے ۔ مثلاً بنو ثقیف نے "لات" کو اپنا دیوتا بنارکھاتھا ۔ طائف میں اس نام کا بت تھا۔ باشندگان یثرب (قبائل اوس اور خزرج) اور

[5] البدایہ و النہایہ ص ۲۴۷ ج۲

جو ان کے ہم مشرب و پیروتھے ان کا مخصوص دیوتا "منات" تھا جو ساحل سمندر پر مشلل کے ایک جانب قدید میں تھا جو ایک مقام کا نام تھا ۔ ❷

حضرت نوح علیسلم کی قوم نے جو دیوتا بنارکھے تھے جب عرب میں بت پرستی کا رواج ہوا تو احیائی ذہنیت نے ان فراموش شدہ دیوتاؤں کو پھر یاد دلادیا ۔ پھر کسی طرح وہ مورتیاں بھی برآمد کرلی گئیں تو مختلف قبائل ان دیوتاؤں کے بھگت (پوجاری) ہوگئے ۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس ضاللہعنہ نے ان کی تفصیل یہ بیان کی ہے ۔ ❶

وُدّ : بمقام دومتہ الجندل ۔ قبیلہ کلب اس کا بھگت تھا ۔

سواع : بمقام رہاط، ساحل سمندر کے قریب ۔ قبیلہ ہذیل اس کا بھگت تھا ۔

یغوث :بمقام جرف (یمن) پہلے قبیلہ مراد اس کی خدمت کیاکرتا تھا پھر بنو غطیف اس کے خادم اور بھگت بن گئے ۔

یعوق :اہل ہمدان اس کے پجاری تھے ۔

نسر : ذی الکلاع (جو علاقہ حمیر) کا مشہور خاندان تھا اس کا بھگت تھا۔ یہ تمام صنم اور ان کے مندر اگرچہ علاقائی حیثیت رکھتے تھے مگر طواف، نذرانہ اورقربانی وغیرہ کی رسومات جو کعبہ میں انجام دی جاتی تھیں وہ یہاں بھی پوری کی جاتی تھیں ۔ اور خانہ کعبہ

---

❷ بخاری شریف ۳۲۲
❶ بخاری شریف ص ۷۳۲

کے خدام کے جو منصب تھے، کلید برادری، دربانی اور ایسار وغیرہ یہ تمام منصب ان علاقائی کعبوں کے خدام کے بھی ہوا کرتے تھے ۔ اس طرح پورے عرب میں مندروں یا چھوٹے بڑے کعبوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ خدام اور پوجاریوں کے سیکڑوں خاندان اس نظام سے وابستہ تھے۔ اس پورے نظام کا مرکز کعبہ تھا۔[2] اس کو حضرت ابراہیم علیسلم کا بنایا ہوا "بیت اللہ" سمجھا جاتا تھا اور اسی کے گرد طواف کرکے حج کا مقدس فرض انجام دیا جاتا تھا ۔ پس جو یہاں کے خادم تھے وہ پورے عرب کے مخدوم تھے اور جب کہ یعمربن عوف کا یہ فیصلہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ وراثت ابراہیم اور تولیت کعبہ کا حق قریش کو ہے تو قریش پورے عرب کے مخدوم اور مذہبی مقتدا تھے ۔

سیاسی قیادت

بت پرستی کے اس نظام نے قریش کو پورے عرب کا مذہبی پیشوا ضرور بنادیا تھا مگر قریش کی عظمت صرف اس نظام پر موقوف نہیں تھی، بلکہ اس زمانہ کے بین الاقوامی سیاسی گٹھ جوڑ نے بھی قریش کو ایسی حیثیت دیدی تھی کہ پورے عرب کا اس سے متاثر ہونا ضروری تھا ۔

روم (باز نطینی)، ایران اور حبش تینوں سلطنتوں کے بیچ میں عرب حد فاصل تھا ۔

تینوں سلطنتیں عرب پر نظر رکھتی تھیں ۔

---

[2] سیرت ابن ہشام ص ۵۴ ج۱

قریش اس حیثیت کو پہنچانتے تھے اور اس سے کام لینا بھی جانتے تھے ۔ قصی نے بنو خزاعہ کا مقابلہ کیا اور ان کو مکہ سے نکالا تو نہ صرف یہ کہ شہنشاہ روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت اس کو حاصل تھی بلکہ ابن قتیبہ کی شہادت یہ ہے کہ اعانہ قیصرعلیها[3] (قیصرروم[1] نے اس کو کمک بھی پہنچائی تھی)

قصی کے پوتوں نے ان تعلقات کو وسیع کیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایران، روم، حبش اور ملوک یمن آپس میں ایک دوسرے کے حریف تھے مگر آل عبدمناف (قصی کے پوتوں) نے سب سے قریش کے لئے یکساں حقوق اور رعایتیں حاصل کرلیں ۔ چنانچہ مطلب نے شاہ حبش (نجاشی) اور اس کے حریف شاہان یمن (ملوک حمیر) سے، نوفل نے شہنشاہ ایران (کسریٰ) سے اور ہاشم نے بازنطینی شہنشاہ ہرقل سے قریش کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کرلئے ۔[2]

ابن سعد کا بیان ہے : ہاشم ایک شریف آدمی تھا یہی ہاشم ہے جس نے قیصر (شہنشاہ روم) سے یہ حلف لیا تھا (فرمان حاصل کرلیا تھا) کہ اس کے حدود مملکت میں قریش کو آزادی ہوگی ۔ ان کے جان ومال کو

---

[3] معارف ابن قتیبہ ۲۱۵ ملوک الشام

[1] بازنطینی شہنشاہ کو عرب قیصر کہاکرتے اور ایران کے شہنشاہ کو کسریٰ اور شاہ حبش کو نجاشی کہاکرتے تھے ۔

[2] طبقات ابن سعد ۴۳ جلد ۱،

کوئی خطرہ نہیں ہوگا ۔ قیصر روم نے یہ فرمان اپنی مملکت کے لئے دیا اور اپنے دوست ملک (حبش) کے بادشاہ نجاشی کو بھی لکھ دیا کہ وہ اپنے ملک میں قریش کو آمدورفت اور کاروبار کی اجازت دیں ۔[3]

ہاشم نے فرامین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریش کی تجارت کو منظم کیا۔ تجارتی قافلوں کا ایسا پروگرام بنایا کہ وہ سال بھر رواں رہتے اور جہاں جاتے موسم کی خوشگواری ان کا استقبال کرتی ۔ سردیوں میں یمن کی طرف جاتے اور حبشہ تک تجارتی قافلے پہنچتے اور گرمیوں میں شام کی طرف غزہ تک اور کبھی انقرہ تک تجارتی قافلے پہنچتے تھے ۔ بسا اوقات ہاشم خود ان کی قیادت کرتا تھا ۔[4]

دیگر قبائل کے لئے مراعات:

ان طویل راستوں میں جو قبائل پڑتے تھے ان کے لئے مراعات یہ تھیں کہ قریش کے قافلے ان کا سامان بھی لے جاتے۔ مزید احسان یہ کرتے کہ سامان لیجانے لانے کا محصول تو درکنار بار برداری کا خرچ بھی نہ لیتے تھے ۔[5]

مکہ مکرمہ پورے عرب کا مرکزی شہر (ام

---

[3] ابن سعد ۴۵ ج۱

[4] ابن سعد ۴۳ ، ۴۵ ، ج۱

[5] ابن سعد ۴۵ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کو ایلاف سے تعبیر کیا ہے (یعنی مانوس کرنا)۔ تشریح آگے آئے گی ۔ انشاءاللہ ۔

القریٰ) تھا۔ سیاسی قیادت کے لئے یہی کافی تھا کہ قریش ام القریٰ پر قابض اور اس کے مالک تھے۔ مزید برآں آل مناف نے پڑوسی ممالک سے یہ رعایتیں حاصل کرکے قریش کے آسمان قیادت کو ماہ و پروین اور کہکشاں سے آراستہ کردیا ۔ اب پورا عرب قریش کا کلمہ گو اور اس کے احسانات کا ممنون تھا ۔

عرب کا تجارتی نظام اور قریش کی سربراہی

بت پرستی کے منطقوں کی طرح عرب کے ایسے علاقے بھی ہوگئے تھے جن کو تجارتی منطقہ کہاجاسکتا تھا ۔

قصبوں اور شہروں میں چھوٹے بڑے بازار بھی تھے۔ ہفتہ وار بازار بھی جگہ جگہ لگا کرتے تھے۔ لیکن ہر ایک منطقہ کے مرکزی مقام پر ایک میلہ سالانہ ہوتا تھا جس میں نہ صرف عرب بلکہ قریب کے (غیرعرب) علاقوں کے تاجر بھی مال لاتے، دوکانیں لگاتے اور نفع کماتے تھے۔ یہ پورے سال کے بارہ مہینوں میں دائر سائر رہتے ۔ مورخین نے ان میلوں کی تفصیل و ترتیب یہ بیان کی ہے۔

(۱) دومتہ الجندل میں جو شام و حجاز کے مابین ہے۔ یکم ربیع الاول کو میلا لگتا جو پورے مہینہ رہتا۔

(۲) یہاں سے لوگ چل کر بحرین میں مشقر آتے ۔ یہاں یکم سے آخر جمادی الاخریٰ تک میلہ لگتا اور دو متہ الجندل کی طرح یہاں

بھی مقامی حکمران کو عشر (دس فیصدی) (چنگی یا کسٹم) دیا جاتا ہے ایران تک کے تاجر سامان لے کر یہاں آتے ہیں۔

(۳)یکم رجب کو مشقر سے بازار اجڑتا تو صحار کے لئے روانگی ہوتی جو عمان کا پررونق شہر تھا ۔ تقریباً بیس دن راستے میں صرف ہوتے۔ یہاں پانچ دن کا میلہ ہوتا اور بادشاہ جُلندی کوعشردیا جاتا تھا ۔

(۴) رجب کے آخر میں دبا کا میلہ شروع ہوتا یہ عرب کی دوبڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھا ۔ یہاں سندھ ، ہند ، چین اور مشرق و مغرب کے لوگ آتے اور خشکی اورسمندر کے راستوں سے سامان لاتے، یہاں کا عشر بھی بادشاہ جلندی کو ملتا ۔

(۵) اس کے بعد مہرہ کے شہرشحرمیں وسط شعبان سے میلہ لگتا جہاں بری اور بحری جہاز دباسے چل کر آتے ۔ یہ کھالوں اور کپڑے کی خاص منڈی تھی۔ مقامی پیداوار کی جنسیں ایلوا ، لوبان وغیرہ بھی یہاں سے خریدی جاتیں ۔

(۶)پھر یکم رمضان سے عدن میں میلا لگتا۔ عدن میں جو عطربنتا تھا اس کی دور دور تک شہرت تھی۔ بحری راستے سے آنے والے سندھ اور ہند تک اور خشکی کے راستے سے آنے والے ایران اور روم تک یہاں کا عطرلے جاتے تھے ۔ یہاں کا عشرایران کے نوآباد کار افسر لیتے تھے ۔

(۷) عدن کے بعد صنعاء(یمن) کا میلہ لگتا جو

وسط رمضان سے آخر رمضان تک رہتا ۔
یہاں روئی، زعفران، مختلف قسم کے رنگوں
اور لوہے کی منڈیاں تھیں یہاں کا عشر بھی
شاہ ایران کا گورنر لیتا تھا ۔

(۸،۹) وسط ذی تعدہ سے آخر ماہ تک دو میلے
لگتے :

(الف) رابیہ میں جو علاقہ حضر موت کا
ایک شہر تھا ۔

(ب) عکاظ میں جو مکہ اور عرفات کے
درمیان شہر تھا ۔

(۱۰) عکاظ کے قریب ذی المجاز ہے۔ یہاں یکم
ذی الحجہ سے میلہ لگتا جو دس ذی الحجہ
تک رہتا ۔

(۱۱) زمانہ حج میں (۱۰ ذی الحجہ سے ۱۵ ذی
الحجہ تک) منیٰ میں میلا لگتا ۔

(۱۲،۱۳) منیٰ سے فارغ ہوکر لوگ خیبر یا یمامہ
جاتے جہاں محرم کی دسویں سے میلے لگتے ۔

(۱۴،۱۵) اس کے بعد جنوبی فلسطین میں بصریٰ
اور اذرعات کے میلے لگتے۔ [5]

ان تمام میلوں میں سب سے زیادہ اہمیت
عکاظ اور ذوالمجاز کے میلوں کو تھی کیونکہ
(الف) یہ میلے شہر حرم میں لگتے تھے۔ جو
پورے عرب کے لئے امن و پناہ کے مہینے تھے۔ اس
لئے سب طرف سے بڑی بڑی تعداد میں تاجر اور
زائرین امن کی بانسری بجاتے ہوئے یہاں آتے،
رسومات حج ادا کرتے ، مال خریدتے اور عیش و

---

[5] کتاب المحبر واسواق العرب لمحمدین حبیب (مزروقی)

تفریح کی مجلسیں جماتے ۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میلہ میں عام نگرانی، حفاظت اور جو ہنگامہ ہوجاتے ان کے مقدمات کی سماعت اور ان کا فیصلہ کرنا "قبیلہ تمیم" کے متعلق ہوتا تھا۔ جبکہ قبیلہ تمیم کا مسکن عرب کی انتہا ، مشرق تھا اور مکہ و عکاظ انتہا مغرب میں تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان میلوں سے پورے عرب کا تعلق رہتا اور تعلق بھی عقیدتمندانہ ہوتا تھا ۔

میدان تجارت میں قریش کی سربراہی

(۱) عکاظ اور ذی المجاز کے مذکورہ بالا عظیم الشان میلوں کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ تھی کہ اس موقع پر بڑے بڑے اجتماعات بھی ہوا کرتے تھے جن میں پورے عرب کے اساتذہ شعروسخن شرکت کرتے، ادبی مقابلے ہوتے، دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے ۔ مشہور مقررین کی تقریریں ہوتیں جن میں وہ اپنے قبائل کے کارنامے بیان کرتے۔ مختصریہ کہ مذہبی جشن (حج) کے ساتھ قومی جشن بھی منائے جاتے تھے ۔ ان میلوں کے جملہ انتظامات قریش سے متعلق تھے یاقریش کے تعاون سے ہوتے تھے ۔ اس طرح میلوں کے سلسلہ میں بھی قریش کو سربراہی حاصل تھی۔

(۲) قریش نے جب تجارت کو منظم کرتے ہوئے رحلتہ الشتاءوالصیف موسم گرما اور سرمائی قافلوں کا طریقہ ایجاد کیا اور اس طرح ان کا

تجارتی سلسلہ عرب کے چپے چپے میں پھیل گیا تو انہوں نے ایک حفاظتی فوج بھی تیار کی جس میں حبشی غلام اورتنخواہ دار سپاہی ہوتے تھے ۔ اس کو قائمہ کہاجاتا تھا ۔ یہ فوج قریش کے قافلوں کی طرح حلیف قبائل کے قافلوں کی بھی حفاظت کرتی تھی ۔[1]

(۳) جیساکہ[2] پہلے گذرچکاہے عرب میں نہ کوئی سلطنت تھی نہ حکومت، نہ فوج، نہ پولیس، البتہ قبائلی معاہدات کا ایک سلسلہ تھا جو افراد کی جان ومال کی حفاظت کا ذریعہ ہوتاتھا۔ قبائل کے معاہداتی گروپ تھے۔ جو فرد کسی گروپ سے تعلق رکھتا تھا تو پورا گروپ اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا ۔ اس ذمہ داری کا نام خَفارت[3] تھا ۔ راہرو کو اس کی سند دیدی جاتی تھی تو وہ اس گروپ کے حدود تک محفوظ رہتا تھا ۔ اس سند کو بھی خفارت ہی کہاجاتا تھا (یعنی پروانہ راہداری یا ویزا) کبھی خفارت پرمعاوضہ بھی لیا جاتا تھا ۔

قریش کے تعلقات کا دائرہ پورے عرب کو گھیرے ہوئے تھا تو اس کا "پروانہ راہ داری" خفارہ بھی پورے عرب کے لئے کافی ہوتا تھا ۔

(۴) تنظیم تجارت اور تجارتی قافلوں کے ذریعے

---

[1] المحبر لمحمد بن حبیب

[2] زیر عنوان معاہداتی حکومت

[3] اس زمہ داری کی خلاف ورزی کو اخفاءکہتے تھے ۔ کماقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ من صلی القداة فی زمہ اللہ فلایخفرن اللہ فی ذمتہ (مجمع البحار)

جب دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہوئے تو پہلے تو یہ ہوا کہ تجارتی قافلے واپسی کے وقت شام اور یمن وغیرہ سے غلہ بھرکر لاتے تھے تو مکہ اور اطراف مکہ جہاں کاشت کانام و نشان نہیں تھا وہاں غلہ کی فراوانی ہوگئی ۔ پھران ممالک کے باشندوں نے خود بھی غلہ کی روانگی (سپلائی) شروع کردی۔ خشکی کے راستوں سے بھی غلہ آتا اور بحری راستے سے بھی جدہ کی بندرگاہ پر غلہ اتاراجاتا تھا ۔[۴]

یہ تھے وہ اسباب جن کی بناءپر قریش کو مذہبی عظمت اور سیاسی قیادت کی طرح اقتصادی برتری اور تجارتی سربراہی بھی حاصل ہوگئی۔

واقعہ اصحاب فیل

قصی کا زمانہ بظاہر چوتھی صدی عیسوی کا وہ ابتدائی نصف ہے جب مسیحیت، جدید ترتیب کے ساتھ ظہور پذیرہوئی تھی ۔ تثلیث کوجزودین بنایا گیا تھا اور قسطنطین اول نے مسیحیت قبول کرکے حکومت کا مذہب بھی عیسائیت قرار دیدیا تھا ۔ جب مسیحیت کامرکز رومتہ الکبریٰ اٹلی بنا تو مسیحیت کی لہران تمام علاقوں میں پہنچی جو بازنطینی شہنشاہیت کے زیر اثر اور اس بلاک میں داخل

---

[۴] ابن قتیبہ کے استاذ محمد بن حبیب المتونی ۲۴۵ھ، ۸۵۹ عیسوی نے اپنی کتاب المحبر میں اس کی تفصیل دی ہے ص ۲۶۳، ۲۶۴ ۔

تھے۔ عرب کے وہ علاقے جو شام سے متصل تھے، افریقہ کے علاقے خصوصاً حبش اور یمن کے بھی کچھ علاقے عیسائیت سے متاثر ہوئے ۔[1]

بازنطینی شہنشاہ (قیصرروم) نے قصی کی امداد کی پھر ہاشم کے ساتھ یہ مراعات کی کہ قیصر نے اپنی طرف سے بھی اس کو آزادانہ تجارت کا پروانہ دیا اور شہنشاہ حبش سے بھی مراعات دلوائی۔ اس کا مقصد خالص سیاسی بھی ہوسکتا ہے کہ ایران کے مقابلے میں عربوں کو اپنی طرف مائل اورتجارتی راستوں کو اپنے زیر اثررکھے۔ اور اس کا مقصد مذہبی بھی ہوسکتا ہے کہ عرب میں عیسائیت کو رواج دے ۔ غالباً اسی سلسلے کی آخری کڑی یہ تھی کہ ابرہہ نے (جوخود عیسائی تھا اور حبش کے عیسائی بادشاہ نجاشی کی طرف سے یمن کا گورنر تھا) یمن کے مرکزی شہر صنعاءمیں نہایت عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا[2] تو عربوں کو ہدایت کی کہ وہ خانہ کعبہ کے بجائے اس کلیسا کو اپنا معبد بنائیں اور اسی کا طواف کیاکریں ۔ مگر جب عربوں نے اس کا انکار کیا تو ابرہہ نے لشکر کشی کردی ۔

ابرہہ نے دریافت کیا: آپ کیا چاہتے ہیں ؟ خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا ۔ آپ کی فوج نے میرے دو سو اونٹ لوٹ لئے ہیں ، میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کو واپس کرادیں ۔ ابرہہ حیران ہوا۔ اس نے ترجمان سے کہا: ان سے کہو کہ آپ کی

---

[1] تفصیل کےلئے ملاحظہ ہو عہد زریں ص، ۲۸۴ تا ۳۰۱
[2] ابن سعد ص ۵۵، ج۱

وجاہت اور شاندار صورت سے میں متاثر ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ کوئی بڑا مطالبہ پیش کرینگے، آپ نے صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کی درخواست کی اور تعجب ہے آپ نے اس کعبہ کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جو آپ کا اور آپ کے آباو اجداد کا دین اور دھرم رہا ہے ۔

خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا :

”اس بیت کا ایک رب ہے اس کا محافظ وہ ہے اس کی فکر وہ کرے گا۔ میں اس بیت کا مالک نہیں ہوں ، میں ان اونٹوں کا مالک ہوں جن کی واپسی کی میں نے درخواست کی ہے ۔ “

ابن ہشام[3] کی روایت ہے کہ حناطہ نے عبدالمطلب سے پہلے دو اور سرداروں کو پیش کیا تھا۔ ایک قبیلہ بنی بکر کے شیخ عمر بن نفاثہ اور دوسرے قبیلہ ہذیل کے سردار خویلدبن نائلہ۔ ان دونوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ مکہ میں جو کچھ دولت ہے اس کی ایک تہائی ابرہہ منظور کرلے اور ہدم کعبہ کے ارادے سے باز آجائے۔ مگر ابرہہ نے اس پیش کش کو مسترد کردیا ۔ اس روایت کو سامنے رکھاجائے تو عبدالمطلب کی یہ موقع شناسی تھی کہ انہوں نے کعبہ کے متعلق ابرہہ سے کوئی بات ہی نہیں کی ۔ صرف اپنے اونٹوں کی بات کی اور کعبہ کا معاملہ رب کعبہ کے حوالے رکھا ۔

ابرہہ نے اونٹ واپس دلوادیئے ۔ عبدالمطلب

---

[3] سیرۃ ابن ہشام ص۳۳ جلد۱

ان کو لے کر مکے میں آئے۔ تمام اونٹ[1] قربانی کے لئے وقف کردیئے اور مکے والوں کو ہدایت کی کہ شہر خالی کرکے پہاڑوں پر چلے جائیں ۔

پھر تنہا اور ایک روایت کے مطابق چند ساتھیوں [2] کو لے کر حرم کعبہ میں آئے اور خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر کھڑے ہوکرحلقہ باب کو سنبھالا اور یہ منظوم دعا [3]کی :

۱۔ لاهم* ان العبدیمنع رحله فامنع حلالک

۲۔ لایغلبن صلیبهم ومحالهم غدًوامحالک

۳۔ ان کنت تارکهم وقبیلتنا فامرمابدالک

یہ تین اشعار ابن سعد اور ابن ہشام نے نقل کئے ہیں ۔ ان کے علاوہ یہ دو شعر بھی مروی ہیں :

۴۔ جروا جموع جموعهم والفیل کی یسبو عیالک ۔

۵۔ عمدواحماک بکیدهم جهلاومارقبواجلالک

ترجمہ : (۱) اے اللہ ! ایک غلام اپنے کجادے کی حفاظت کرتا ہے۔ بس خدا وند تو ان کی حفاظت کر جو تیرے بیت کے پڑوسی اور مجاور ہیں ۔ (۲) ایسا ہرگز نہ ہوکہ ان کی تدبیراور ان کا مکرو فریب کل کو تیری تدبیر پرغالب آجائے ۔ (۳) اگر میں ان دشمنان کعبہ کو اور

---

[1] ابن سعد ص ۵۶، ج ۱

[2] عمرو بن عائذ، مطعم بن عدی، ابو مسعود ثقفی ابن سعد ۵۶ ج۱

[3] عبدالمطلب نے جو جوابات دیئے ان سے نیز اس دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدا پرست موحد تھے : والاشبہ انہ من اهل الفترة وممن لم تبلغہ الدعوة (حاشیہ سیرة ابن ہشام ص ۳۳ ج ا)

* اصل اللّٰهمّ

اپنے قبیلے کو چھوڑ کر جارہا ہوں (کہ میں مجبور اور بے بس ہوں ۔ میرے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے تو خداوندا) جو تیرا ارادہ ہو اس کا حکم کردے ۔ (۴) یہ اپنے بے شمار لشکروں کو لے آئے ہیں اور ہاتھیوں کو لائے ہیں تاکہ باشندگان مکہ کو جو تیرےعیال ہیں قید کرلیں ۔ (۵) انہوں نے اپنے مکر و فریب اور جہالت سے تیرے حِما (محفوظ علاقۂ حرم) کا قصد کیا ہے۔ انہوں نے تیری عظمت کا پاس و لحاظ نہیں کیا۔"

اس کے بعد کیا ہوا ۔ تاریخ عالم کا وہ عبرت انگیز اورہولناک حادثہ پیش آیا جس کا تذکرہ قرآن حکیم نے بھی کیا ہے ۔ مورخین کا بیان ہے کہ ابرہہ عظیم الشان مسلح فوج کے ساتھ تیرہ قلعہ شکن ہاتھی لایا تھا۔ ان میں سب سے بڑا ہیبت ناک اور بڑے ڈیل ڈول کا ہاتھی محمود تھا ۔ وہ ہاتھیوں کی کمان کررہا تھا۔ جب حملہ کا وقت آیا تو یہ ہاتھی اپنی جگہ جم گیا۔ بہت مارا پیٹا مگر یہ آگے کی طرف حرکت نہ کرتا، دائیں بائیں اس کا رخ کردیا جاتا تو خوب لپک کر چلتا ۔

یہاں ہاتھی کا یہ تماشا ہورہا تھا۔ ادھر آسمان پر پرندوں کی قطار نمودار ہوئی ۔ ایک پرندہ تین کنکریاں لئے ہوئے تھا۔ ایک ایک چونچ میں دو دو پنجوں میں ۔ یہ کنکریاں چنے کی اور مسور کے دانے کے برابر تھیں ۔ یہ کنکریاں جس پرپڑتیں اس کا چورا کردیتی تھیں ۔ پھر پانی کی ایک رو آئی اس نے ان سب کو بہاکر سمندر میں ڈال دیا۔ ابرہہ اور اس کے مخصوص ساتھی

اس وقت ختم نہیں ہوئے وہ بھاگے اور طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا ہوکر راستے ہی میں مرگئے۔ ابرہہ کو ایسی بیماری لگی کہ اس کا بدن گل گیا، ایک ایک عضو گل کر گرتا رہا۔ وہ صنعا پہنچ گیا مگر اس حالت میں پہنچا کہ گوشت کالوتھڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس کا سینہ پھٹا ، دل باہر نکل آیا اور دل کے ساتھ جان بھی نکل گئی ۔[1]

واقعہ اصحاب فیل کے نتائج

جیسے یہ واقعہ غیرمعمولی تھا ، قدرتی بات تھی کہ نتائج بھی غیرمعمولی ہوئے ۔ سیاسی لحاظ سے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

(۱) عربوں کو قیصر روم اور اس کے ماتحت حکومتوں سے نفرت ہوئی۔ اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب روم کی فوجوں کو ایران نے شکست دی تو مکے والے بہت خوش ہوئے ۔[2]

(۲) یمن کی وہ طاقتیں جو ابرہہ کی طاقت کے سامنے جھک گئی تھیں ابھریں اور انہوں نے شہنشاہ ایران (کسریٰ) سے مدد لے کر ابرہہ کے باقی ماندہ اثرات کو یمن سے ختم کیا ۔

(۳) یمن کی یہ ابھرنے والی طاقتیں اچھی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں ۔ ان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی تو کسریٰ نے براہ راست

---

[1] ابن ہشام ۵۳ ج ا

[2] سورہ روم کی ابتدائی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

یمن کے ایک علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا اوروہاں اپنا گورنر مقرر کردیا ۔❸

تصدیق کلام

اصحاب فیل کا یہ واقعہ جس طرح قادر ذوالجلال کی قدرت بے پایاں کا مظاہرہ تھا ایسے ہی قریش پر احسان عظیم بھی تھا۔ قریش خراب وخستہ تھے مگر رب ذوالجلال کو ان سے کام لینا تھا۔ یہی قریش تھے جنہوں نے کچھ دنوں بعد دنیا کا چولا بدلا اورعالم انسانیت کو ایسے زیور سے آراستہ کیاجو اسی طرح بے مثال و بے نظیر ہے جس طرح تاریخ عالم میں اصحاب فیل کا واقعہ بے نظیر ہے ۔

سورہ فیل میں اللہ تعالیٰ نے اسی احسان عظیم کا تذکرہ فرمایا ہے۔ خطاب اگرچہ آنحضرت ﷺ کو (یا ہراس شخص کو ہے جو قابل خطاب ہو) مگر روئے سخن قریش کی طرف ہے۔ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر ؒ کے الفاظ میں کسی قدر تشریح کے ساتھ یہ ہے :

> ”تونے نہیں دیکھا ، کیاکیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا نہ کردیا ان کا داؤغلط اور بھیجے ان پر اڑتے جانور تنک تنک (ٹکڑیاں بناکر) پھینکتے ان پر پتھریاں کنکرکی (ٹھیکرے کی) پھر کر ڈالا ان کو جیسے بھس ہوکھایا ہوا ۔“

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قریش کو

---

❸ جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو کسریٰ کی طرف سے یمن کا گورنر باذان تھا جو دولت اسلام سے مشرف ہوا ۔ (ابوالفداء)۔

خاص طور سے حکم دیا ہے کہ وہ رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ کی عبادت کریں اور اس حکم کی معقولیت کے لئے وہ احسانات شمار کرائے ہیں ، جن کی تفصیل وہ ہے جو اس کتابچہ کے اوراق میں پیش کی گئی ۔ مختصر یہ ہے کہ

(۱) اس سورت میں سب سے زیادہ بیت پرزور دیاگیا ہے، یہاں تک کہ ذات معبود کے لئے اللہ یارحمن کے بجائے رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ کا لفظ لایا گیا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ عظمت قریش کے قلعہ معلی کا سنگ بنیاد بیت ہی تھا (یعنی کعبہ)۔

(۲) یہی بیت تھا جس کی وجہ سے قریش کا اثر عرب پر قائم ہوا۔ قریش نے بیت کی خدمت کی اور وہ عرب کے سرتاج بنے۔

(۳) قریش نے بیت اللہ کی زیارت کرنے والوں (حجاج) کی خدمت کی وہ پورے عرب میں محبوب ہوگئے ۔

(۴) یہی محبوبیت تھی جس کی بناءپر پورے عرب کی پرآشوب اور خوں آشام زمین ان کے لئے امن کا گہوارہ بن گئی ۔ چار ماہ کے بجائے پورے بارہ ماہ ان کے لئے حرم رہتے تھے اور بلاخطرجہاں چاہتے جاتے تھے ۔

(۵) یہی عظمت تھی جس کی بنا پر وہ قیصر و کسریٰ اور نجاشی تک پہنچے اور ان سے تجارت کے پروانے حاصل کئے ۔

(۶) اندرون عرب عربوں کی عقیدت اور ان کی ارادتمندی اور احسان شناسی اور بیرون عرب فرامین شاہی کی طاقت نے قریش کو موقع دیا

کہ ان کا رہنما ہاشم رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ اور رِحْلَۃَ الصَّیْفِ الصیف کا طریقہ ایجاد کرسکا اور تجارت کو منظم کرسکا ۔

(۷) مکہ اور اطراف مکہ میں غلہ عنقا تھا ۔شکار کا گوشت اور کھجوریں عام غذا تھی ۔ رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ کی ایجاد نے ان کو موقع دیا کہ وہ واپسی کے وقت غلہ لاسکیں اور عرب کا فاقہ توڑسکیں ۔

(۸) کلبی کی تحقیق یہ ہے کہ ہاشم ابن عبدمناف پہلا شخص ہے جو شام کے علاقہ میں تجارتی قافلہ لے کر گیا اور وہاں سے گیہوں بھرکر لایا ۔❶

(۹) اسی سورت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ ہے کہ قریش کی حالت نہایت ابتر تھی وہ فاقہ کش تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہاشم کو توفیق بخشی کہ انہوں نے رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ کا طریقہ ایجاد کیا۔ اب ان کو بہت کافی نفع ہوتا تھا۔ بڑے تاجر اپنے منافع غریبوں اور فقیروں کو تقسیم کردیاکرتے تھے تو ان کے فقیر بھی امیروں کی طرح ہوجاتے تھے ۔❷

(۱۰) جب رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ سے تجارتی تعلقات دوسرے ممالک سے قائم ہوگئے تو پھر غلے کی درآمدکیلئے ان قریشی قافلوں کی ضرورت بھی نہیں رہی بلکہ دوسرے ممالک خود غلہ بھیجنے لگے ۔ یمن میں تُبالہ اور جُرش میں بہت غلہ پیدا ہوتا تھا۔ وہاں کے کچھ تاجر بحری

---

❶ تفسیر مظہری (تفسیر سورۃ قریش)

❷ ایضاً

راستے سے بندرگاہ جدہ پر غلہ پہنچاتے تھے۔ کچھ تاجر خشکی کے راستے سے براہ راست مکہ غلہ پہنچاتے تھے۔ اسی طرح شام کے تاجر بھی غلہ سپلائی کرتے تھے۔[3] یہ اونٹ اور خچر اور گدھے جن پر خشکی کے راستوں سے غلہ آتا تھا ان کا پڑاؤ محصبّ ہوتا تھا جس کو ابطح ، بطحا اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے تھے[4] جو مکہ اور منیٰ کے درمیان ہے۔ یہی ہے اَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ (کھانادیا بھوک میں) کا احسان عظیم ۔

(۱۱) حرم کعبہ کا احترام اگر چہ حضرت اسماعیل و حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلاآرہا تھا اور اس وجہ سے حرم مکہ کے رہنے والے مامون رہا کرتے تھے ۔ مگر جب رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ کے سلسلہ میں مامونیت کا تذکرہ ہے تو اس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ قریش کے یہ سرمائی اور گرمائی قافلہ مال لیجانے اور لانے میں راستے کے قبائل کی جو خدمت کیاکرتے تھے، اس حسن سلوک نے قریش کو خارج حرم ان قبائل کی حدود میں بھی محفوظ و مامون کردیا تھا جن کا پیشہ ہی غارتگری تھا۔ عبادت رب کے حکم کی معقولیت سمجھانے کیلئے ان گیارہ احسانات کی طرف اس سورت (سورۂ قریش) میں اشارہ کیااور ایک احسان عظیم وہ تھا کہ مکہ اور اہل مکہ کو اصحاب فیل سے محفوظ رکھا۔ اس کی نوعیت چونکہ جداگانہ تھی کہ وہ دنیاوی اسباب سے بالا و برتر محض اللہ تعالیٰ

---

[3] معالم التنزیل
[4] معجم البلدان

کی قدرت کا معجزہ تھا، تو اس کو مستقل سورت میں ذکر فرمایا اور بظاہر یہی حکمت ہے ان دونوں سورتوں کے متصل ہونے کی ہے